لاتوں کے بھوت

(طنز و مزاح)

اعتبار ساجد

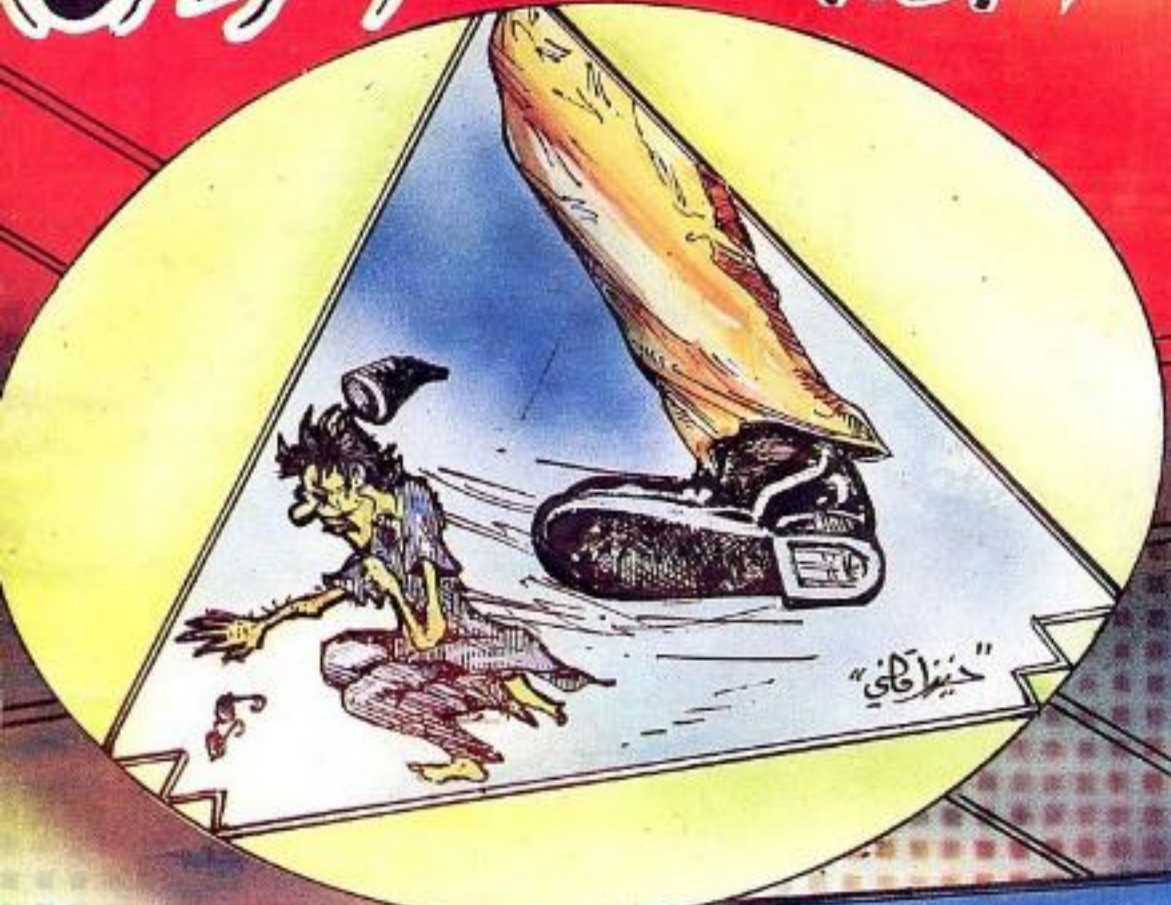

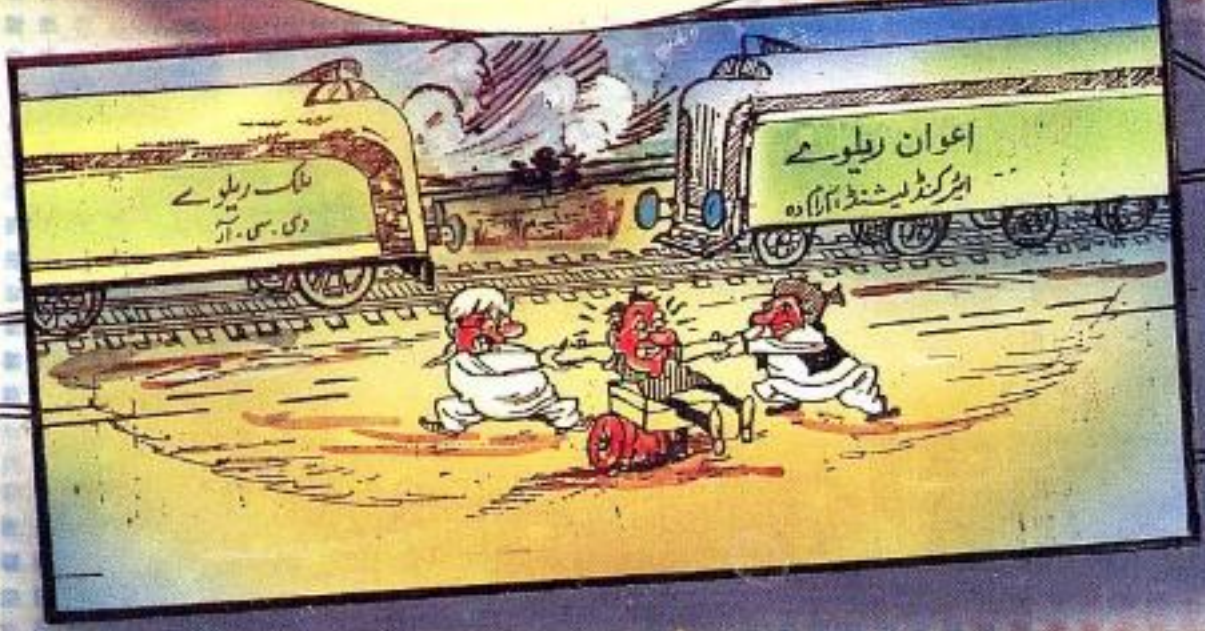

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	ایک دِن کا ذکر ہے	۵
۲	جندوڑا واچ کمپنی	۱۲
۳	کیا وقت ہوا ہے ؟	۲۵
۴	لاتوں کے بھُوت	۳۰
۵	جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز	۳۶
۶	ظالم ہیں لوگ اِدھر کے	۵۹
۷	تھاں مار دیاں گا !	۶۱
۸	اصلی اور نقلی شیر	۶۴
۹	ڈزا ڈز تے کھچا کھچ	۶۷
۱۰	اُدور کوٹ کا قبضہ	۷۰
۱۱	ہماری خدمات پھر حاضر ہیں	۷۳
۱۲	ویل کم گاما بھنڈی	۷۶
۱۳	اپنا اُلو سیدھا کروائیے	۷۹
۱۴	میڈم سو رہی ہیں	۸۲
۱۵	اگر اقبال زندہ ہوتے	۸۵
۱۶	سردار بکھیڑا سنگھ	۸۹

ایک دن کا ذکر ہے

ٹرین کو تین بجے روانہ ہونا تھا۔ ہم اسٹیشن پہنچے تو سوا تین بج چکے تھے ٹیکسی سے چھلانگ لگا کر ہم بریف کیس سنبھالے تیزی سے آگے لپکے۔ اسٹیشن کی عمارت کے پاس پہنچے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر طرف غیر معمولی چہل پہل تھی۔ رنگ برنگے بینر اور بورڈ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ ایک اپٹوڈیٹ نوجوان نے ہمارا بریف کیس پکڑنا چاہا۔ ہم سمجھے اچکا ہے لیکن یہ کہہ کر اس نے ہمیں حیران کر دیا کہ وہ ٹھگ، رہزن یا چور اچکا نہیں ملازم ہے۔

ہم نے پوچھا "کس کے ملازم ہو۔ پولیس کے؟"

بولا "نہیں جی میں تو اعوان ریلوے کمپنی کا نمائندہ ہوں"۔

ہم نے حیرت سے کہا "کیا مطلب"

وہ ہنس کر بولا "لو آپ کو نہیں پتا، ریلوے پرائیویٹ سیکٹر میں چلی گئی ہے حکومت نے سارا انتظام پرائیویٹ کمپنیوں کو دے دیا ہے۔ میں اعوان ریلوے کمپنی کا نمائندہ ہوں آپ کو لینے آیا ہوں۔ ہماری ٹرین تیار کھڑی ہے۔ بس پانچ منٹ بعد روانہ ہونے والی ہے چلیں میرے ساتھ۔ آپ کو ٹرین میں بٹھا آؤں"۔

اتنے میں تلوار مار کہ مونچھوں والے ایک اور خوش لباس نوجوان نے ہمارا بازو پکڑ لیا۔ بولا۔ "جناب، ان کے چکر میں نہ آئیں یہ ابھی دو گھنٹے تک اسی طرح سواریاں پکڑ پکڑ کر جمع کرتے رہیں گے۔ میں نورو بھائی ریلوے کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ میرے ساتھ آئیں"۔

اعوان ریلوے کمپنی کا نمائندہ بگڑ کر بولا۔ "اس کی ٹرین کے ڈبے سن

اٹھارہ سو ایک کے ہیں جناب ۔ ہماری گاڑی تازہ تازہ تیار ہو کر آئی ہے ۔ آپ سیٹ پر بیٹھ کر دیکھیں ' مزہ نہ آئے تو ٹکٹ کے دام واپس "۔

نورو بھائی کا نمائندہ گرج کر بولا ۔ " کون کہتا ہے ہماری ٹرین کے ڈبے پرانے ہیں ؟ ہر چیز ہم نے نئی ڈالی ہے حتیٰ کہ سپرنگ اور گراریاں تک نئی ہیں ۔ کل ہی میں لوکو شیڈ سے گاڑی ٹھیک کروا کر لایا ہوں "۔

اعوان کمپنی کا نمائندہ جیب سے ایک کاغذ نکال کر بولا ۔ " ٹرین کی سواری کے ساتھ تمیز سے بات کرو ۔ ان کے ساتھ سوزوکیوں اور ویگنوں والی سواری کا سلوک نہ کرو ۔ یہ بات پہلے ہی ہماری کمپنیوں کے باہمی معاہدے میں طے پا چکی ہے کہ ہم کسی سواری کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف نہیں کھینچیں گے "۔

نورو بھائی کا نمائندہ کچھ محجوب سا ہو گیا ۔ میرا بازو چھوڑ کر خونخوار نظروں سے اعوان کمپنی کے نمائندے کی طرف دیکھنے لگا ۔ بولا " اگر یہ سواری جاتی ہے تو لے جاؤ لیکن کان کھول کر سن لو اگر اس سواری نے ایک قدم بھی تمہاری طرف بڑھایا تو میں جذبات میں آ جاؤں گا ۔

اچانک ایک تخنی سا آدمی قریب آکر ہم سے کہنے لگا " آپ ان دونوں کی باتوں میں نہ آئیں جناب ۔ میری سنیں ۔ میں شیخ ابراہیم ریلوے کمپنی کا نمائندہ ہوں ۔ ہماری ٹرین میں سفر کریں ۔ انشاء اللہ پھر کسی اور کمپنی کی ٹرین کا رخ نہیں کریں گے ۔ آیئے میرے ساتھ ۔ میں آپ کو اپنی ٹرین دکھاؤں ۔ بے شک دیکھ کر تسلی کر لیں ۔ دل مانے تو صد بسم اللہ ۔ ورنہ جو آپ کی مرضی "

ہم نے کہا " خدا کے بندو ۔ سواریوں کے لیے اتنا مضطرب ہونے کی کیا ضرورت ہے ریل کی پٹڑی تو ایک ہی ہے نا ۔ ظاہر ہے جب اگلی والی ٹرین روانہ ہو گی ۔ تبھی پچھلی ٹرین کے چلنے کی باری آئے گی اور یقینی بات ہے کے آپ کی گاڑیاں پٹڑیوں پر ایک دوسرے کے پیچھے ہی کھڑی ہوئی ہوں گی ۔ "

اس پر تینوں ہنسنے لگے۔ بولے "جناب۔ آپ کی لاعلمی کی بھی حد ہو گئی ہے۔ بادشاہو جب ٹرین کی کمپنی الگ الگ ہے تو پھر ایک پٹڑی پر ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم سب کی اپنی اپنی لائنیں ہیں۔ اپنی اپنی پٹڑیاں ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "پھر تو مقابلے میں ٹرینیں ایک دوسرے کو اوورٹیک بھی کرتی ہوں گی۔" تینوں پھر ہنسے۔ جب ان کی ہنسی تھمی تو کہنے لگے۔ "اوور ٹیک کرنے سے ہمیں کون روک سکتا ہے۔"

"یا اللہ ---" ہم نے گھبرا کر کہا"۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ مسافر بخیرو عافیت اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں"۔

نوربو بھائی کا نمائندہ بولا "ہم نے مسافروں کا ٹھیکہ نہیں لیا جناب، صرف ریلوے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ جو ٹائم ہم نے مقرر کیا ہے عین اس وقت اپنا انجن بند کر دیتے ہیں۔"

ہم نے بوکھلا کر پوچھا "اور آپ لوگ کہیں درمیان میں رکتے نہیں"؟

اعوان کمپنی کا نمائندہ بولا۔ "رکتے کیوں نہیں۔ لیکن اسٹیشن ہماری مرضی کا ہوتا ہے کمپنی نے جو اسٹیشن ٹھیکے پر لئے ہیں ہماری ٹرین صرف وہیں رکتی ہے۔ ہاں درمیان میں کوئی سواری ہاتھ دے دے تو ٹرین روکنا ہمارا فرض بن جاتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "اور سواری کو اتارنا۔"

بولا "یہ سواری کا فرض ہے۔ ہمارے اپنے اسٹیشن سے پہلے جہاں کہیں اسے اترنا ہو بے شک چھلانگ مار دے۔ اپنی جان و مال کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ یہ عبارت ہم نے ہر ٹکٹ کے پیچھے لکھوا دی ہے"۔

ہم نے پوچھا۔ "اور اگر کوئی زنجیر کھینچ دے۔"

اس پر وہ تینوں خوب ہنسے۔ بولے۔ "زنجیر کھینچنے کا چکر سرکاری گاڑیوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے یہ سسٹم رکھا ہی نہیں"۔

ہم نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو آدمی

ٹرین بھی نہیں رکوا سکتا؟"
اس پر ان تینوں نے فردا فردا اپنی پیشانیوں پر ہاتھ مار کر کہا "افوہ۔ آپ تو بحث کرنے کھڑے ہو گئے۔ جناب، اکیلے آپ ہی تو نہیں ہیں اسٹیشن پر، ہمیں اور سواریاں بھی پکڑنی ہیں۔ جلدی کریں ---- کوئی فیصلہ کریں"
۔اتنے میں ایک کلاشنکوف بردار شخص نمودار ہوا۔ بڑی بارعب آواز میں بولا "کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے اوئے۔ چپ کرو" پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولا
۔
"موتیوں والی سرکار۔ آپ نے کہاں جانا ہے؟"
ہم نے اسے اپنی منزل بتائی
کہنے لگا "میرے ساتھ آئیں۔ میں چوہدری کرم داد ریلوے کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ ہماری ٹرین کے ہر ڈبے میں وی سی آر موجود ہے۔ مزے سے فلمیں دیکھیں اور آرام سے سفر کریں"۔
اچانک رش بڑھ گیا۔ کچھ ٹیکسیاں اور کاریں آکر رکیں۔ ان میں سے مسافروں نے اپنا اپنا سامان لے کر نکلنا شروع کیا۔ کمپنیوں کے نمائندے ان کی طرف لپکے کلاشنکوف بردار نے ہم سے کہا "آپ یہاں ٹھہریں، میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر اس نے پان والے کو اشارہ کیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بولا جانے مت دینا۔ مگر ادھر وہ سواریوں کی طرف لپکا ادھر ہم پلیٹ فارم کی طرف لپکے۔ وہاں ایک میلے کا سماں تھا۔ عجب رونق تھی ۔ ٹرینوں کو بسوں کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہر ٹرین کے انجن کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ ہر ہر ڈبے اور انجن پر کمپنیوں کے نام کئی کئی رنگوں میں درج تھے۔ شعر بھی لکھے گئے تھے۔ تازہ فلموں کے پوسٹر اور مختلف اشتہارات بھی آویزاں کئے گئے تھے۔ بعض ڈبوں پر تو مختلف اداروں کی مصنوعات کے اتنے اسٹکرز چپکے ہوئے تھے کہ کھڑکیاں تک چھپ گئی تھیں۔ سارے ہی انجنوں اور ڈبوں میں اسٹریو سسٹم نصب تھا۔ ڈولبی ساؤنڈ سسٹم پر زور و شور سے ڈرائیوروں کے پسندیدہ نغمے چل رہے تھے۔ اور ڈرائیور

صاحبان انجن میں بیٹھے یا تو چائے پی رہے تھے یا مونچھیں (اپنی مونچھیں) مروڑ رہے تھے یا اونچی اونچی آواز میں اپنے نمائندوں کو پکار رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یوں تو ہر ٹرین کمپنی کے بے شمار نمائندے تھے مگر ہر ٹرین کے ساتھ دو خصوصی کنڈکٹرز تھے جو مسافروں سے ٹکٹیں چیک کرنے یا دوران سفر ٹکٹیں فروخت کرنے کے کام پر مامور تھے دور دور تک نہ پرانی ریلوے کا کوئی گارڈ تھا نہ ٹکٹ چیکر نہ ٹرین ایگزامنر۔ گیٹ پر مختلف کمپنیوں کے استقبالیہ کاؤنٹر سجے ہوئے تھے۔ ٹکٹیں وہاں فروخت ہو رہی تھیں اور ٹرینوں میں بھی۔ ہر طرف معمول سے زیادہ چہل پہل اور غل غباڑہ تھا۔ شاوٹ سرکٹ ٹی وی پر پنجابی فلموں کے گیت چل رہے تھے۔ بیچ بیچ میں مختلف کمپنیوں کے اناؤنسر اعلانات کر رہے تھے۔

معزز خواتین و حضرات!

خاناں دے خاں ریلوے کمپنی آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔ ہماری ٹرین چار نمبر پلیٹ فارم کے باہر لائن نمبر آٹھ پر کھڑی ہے۔ اور اب سے تھوڑی دیر بعد روانہ ہونے والی ہے۔ براہ کرم جلد تشریف لائیں بہت کم سیٹیں باقی رہ گئی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی تکبیر کا پرچم لہرایا۔ "اللہ ہو اکبر" کا نغمہ گونجنے لگا۔ پھر سکرین پر ایک اور چہرہ ابھرا۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین!

ویئر از اللہ وسایا۔ ہز فیملی از ویٹنگ فار ہم۔

خواتین و حضرات۔ بہنو تے بھراؤ

اللہ وسایا کتھے اے۔ اس دا ٹبر پوندا پھردا جے۔

ایک ٹرین جو دو نمبر پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اس کے مسافر اتر اتر کر انجن کے گرد جمع ہو رہے تھے اور ڈرائیور سے بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔

آخر آپ گاڑی چلاتے کیوں نہیں۔ سارے ڈبے بھر چکے ہیں۔" ایک پستہ قد گنجا آدمی فضا میں مکہ لہرا کر بولا۔

ڈرائیور اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے سگریٹ پی رہا تھا۔ " چلا دیں گے۔ چلا دیں گے۔ آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھو۔ زیادہ اکڑ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

" اپنی ٹکٹوں کے پیچھے پڑھ لو صاف لکھا ہوا ہے کے خریدا ہوا ٹکٹ ناقابل واپسی ہے "۔

" یہ اچھی مصیبت ہے " ایک بڑے میاں جھلا کر بولے " چار بجے ٹرین کی روانگی کا ٹائم تھا۔ اور اب چھ بج رہے ہیں۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ "

ڈرائیور بولا۔ میں کیا کروں جی۔ ملازم آدمی ہوں۔ جب تک اگلے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ہماری ٹرین روانہ نہیں ہو گی۔ ہم اپنی ٹرین اسٹارٹ نہیں کر سکتے "۔

ایک مسافر نے پوچھا۔ " ٹرین اگلے اسٹیشن پر اتنی دیر سے کیوں کھڑی ہے "۔

ڈرائیور بولا " ٹھیکے دار آپس میں حساب کتاب کر رہے ہیں "۔

" کب ختم ہو گا یہ حساب کتاب۔ " ایک گرانڈیل آدمی نے پوچھا۔

ڈرائیور نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی۔ بولا۔ " اللہ جانے ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ادھر سے لائن کلیئر ملے گی تو انجن اسٹارٹ کر دیں گے "۔

ایک مدقوق سا آدمی خوشامدی انداز میں بولا۔ " استاد جی۔ یار پلیز مہربانی کرو۔ اس اسٹیشن پر فون ہی کر دو کہ گاڑی آگے بڑھائیں۔ "

ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ بولا " کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں مگر لائنیں ایکج ہیں۔ غالبا انہوں نے اگلے اسٹیشن پر رکی ہوئی ٹرین والوں سے رابطہ کر رکھا ہے۔ "

" اچھا تو اگلے سے اگلے اسٹیشن پر بھی ٹرین رکی ہوئی ہے " پستہ قد نے پھر مکہ ہوا میں لہرایا۔

" آہو جی " ڈرائیور نے کہا " وہاں بھی حساب کتاب کا پھڈا چل رہا ہے ۔"

مسافر بڑبڑانے لگا " عجب مصیبت ہے دو گھنٹے سے ٹرین میں بٹھا رکھا ہے ۔ کم از کم گاڑیوں کے چلنے کے اوقات تو مقرر تھے ۔ اس سے تو ہزار درجے بہتر ہے کہ گاڑیاں پھر حکومت کے کنٹرول میں واپس چلی جائیں " ۔

اتنے میں کلاشنکوف بردار منظر میں داخل ہوا ۔ چنگھاڑ کر بولا " کیا کھپ مچا رکھی ہے اوئے ۔ چلو اوئے بھائی لوگو ۔ اپنے اپنے ڈبے میں بیٹھو ۔ ڈرائیور کا ٹائم ضائع نہ کرو ۔ گاڑی کو جب چلنا ہو گا تو آپ ہی چل پڑے گی ۔ لیکچر بازی کی ضرورت نہیں ہے ۔ " کلاشنکوف بردار کے تیور دیکھ کر آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی ۔ اچانک اس کی نظر ہم پر پڑی کہنے لگا ۔ " اوئے کہاں غائب ہو گئے تھے بھائی صاحب ۔ میں لہ لہ کر پریشان ہو گیا ۔ ٹکٹ خریدی ہے کہ نہیں ۔ "

ہم نے کہا نہیں سفر کا ارادہ ملتوی کرنے کا خیال ہے ۔

تیوریاں چڑھا کر بولا " کیا مطلب ؟ "

ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا " ریلوے کا حال بھی اب ویگنوں ' سوزوکیوں اور مزدا بسوں والا ہو گیا ہے ۔ اب ہم اسی دن سفر کریں گے جب ٹرینیں سرکاری تحویل میں چلی جائیں گی ۔

وہ دانت پیس کر بولا " اس کا مطلب ہے آپ ہم لوگوں کی روزی پر لات مار کے خوش ہوں گے ۔ "

ہم نے کہا " بد انتظامی اور بے ہنگمی سے تو یہی بہتر ہے ۔ "

اس کے تیور آنا فانا بدل گئے شیر کی طرح دھاڑ کر اس نے ایک چھلانگ لگائی اور چنگھاڑنے لگا ۔ " اوئے کچھ کے ! اگر ٹرین پر سفر نہیں کرنا تھا تو اسٹیشن پر کیوں آیا تھا ۔ "

ہم نے لرزتے ہوئے کہا " بھائی صاحب تمیز سے بات کریں "

" تمیز " وہ گرج کر بولا " اوئے میں تو تیری قمیض پھاڑ دوں گا ۔ ٹوٹے کر

دوں گا۔ پسلیاں بھن دوں گا"
ہم نے بگڑ کر کہا دیکھئے۔ دیکھئے۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔"
اس نے جھنجھلا کر کلاشنکوف کندھے سے اتاری۔ ہم نے پلٹ کر زقند لگائی۔۔ اور ایک مسافر سے الجھ کر دھڑاو سے پلیٹ فارلو کے چکنے فرش پر گرے۔ آنکھ کھلی تو کمبل سمیت فرش پر تھے۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور دھوپ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں چمک رہی تھی۔

جندوڈا واچ کمپنی

گ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ جند وڈا واچ کمپنی کی عبرت انگیز ناکامی کا کیا سبب ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ سوالات کی تکرار سے تنگ آکر میں اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دیتا ہوں اور گہرے تاسف میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا ہوں۔ "اللہ کی مرضی"
اس میں کوئی شک نہیں کہ جندوڈا واچ کمپنی کی تباہی و بربادی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ نہ میں اس کا شیئر ہولڈر تھا۔ نہ مالک۔ نہ پارٹنر۔ البتہ جندوڈے کا دوست ہونے کے ناطے گوں کو جب افسوس کرنے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا تو وہ مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کر کے میرا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔
سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آج کل جندوڈا کہاں ہے۔ غیر ملک میں ہے کہ جیل میں ہے۔ مفرور قیدی ہے یا اشتہاری ملزم ہے۔
حاشا وکلاء مجھے نہیں معلوم کہ جندوڈے پر بعد میں کیا بیتی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ پچھلے سال شروع سردیوں میں وہ ناک منہ سے بھاپ چھوڑتا، سوں سوں کرتا میرے پاس آتا تھا اور اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ پرانی

چیزیں اونے پونے داموں فروخت کرنے والے ایک کباڑی سے وہ کسی گھڑی ساز کا کاٹھ کباڑ کوڑیوں کے مول خرید لایا اور عنقریب " جندوڈا واچ کمپنی " کے نام سے اپنی دکان کا افتتاح کرنے والا ہے۔

میں جندوڈے کو بچپن سے جانتا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا، کہ گھڑیوں کے سلسلے میں اور ان کی مرمت وغیرہ کے معاملے میں جندوڈے کا علم صفر سے بھی دو چار ڈگری نیچے ہے۔ اسے قطعاً معلوم کہ گھڑیوں کے پرزے کس طرح کام کرتے ہیں اور کس طرح اچانک چلتے چلتے رک جاتے ہیں لہٰذا میں نے اس ٹیکنیکل محاذ پر اپنی تشویش کا برملا اظہار کر دیا۔

جندوڈا حسب عادت نتھنے پھلا کر بولا ----- " اس کی تم فکر نہ کرو چین کے شہزادے! میں نے ایک بڑے معقول مستری کا بندوبست کر لیا ہے۔

" کون ہے وہ خوش نصیب؟ " میں نے فرط اشتیاق سے پوچھا۔ عبدالکبیر عرف کبا ---- " جندوڈے نے فاتحانہ شان سے انکشاف کیا۔

میں گھبرا کر بولا۔ " مگر وہ تو سائیکلوں کا مستری تھا ---- "

جندوڈا کہنے لگا۔ " مشینیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں میرے بادشاہ زادے! چاہے سائیکل ہو یا فیور لوبا گھڑی ہو۔ سب میں گراریاں اور کمانیاں ہوتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ استاد کی برکت سے جندوڈا واچ کمپنی ایک انٹرنیشنل واچ کمپنی بن جائے گی۔ تم فکر نہ کرو ---- "

یہ کہہ کر اس نے اپنے کمبل کی بکل سے تین بوسیدہ کتابیں برآمد کیں۔ ایک رہنمائے گھڑی سازی " تھی۔ دوسری " گھڑیاں گھر بیٹھے مرمت کیجئے " اور تیسری " کارآمد گھریلو ٹوٹکے "۔ ان کتابوں کی ایک جھلک مجھے دور سے دکھا کر اس نے کتابیں پھر کمبل میں غائب کر لیں اور اٹھتے ہوئے بولا۔ " اب تم میرے لئے ایک شاندار تقریر تیار کرو جو مجھے دکان کے افتتاح کے موقعے پر پڑھنی ہے۔ بے شک اس میں اپنے تیں چار شعر بھی ڈال دو۔ مگر علامہ اقبال کے اشعار کا تڑکا لگانا مت بھولنا۔ "

جندوڈا تو حسب عادت یہ نادر شاہی حکم دے کر چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ

اب کیا کروں کیسے اسے اس کام سے باز رکھوں جو اس کی سات پشتوں میں بھی کسی نے نہیں کیا۔ مگر جندوڈا میسولینی کی طرح ہٹ دھرم اور ہٹلر کی طرح اڑیل تھا۔ جو بات ایک مرتبہ اس کے دماغ میں بیٹھ جاتی تھی وہ دلیل کے کسی موچنے یا منطق کے کسی زنبور سے باہر نہیں آتی تھی تاوقتیکہ جندوڈا اپنی ضد میں انتہا تک نہ جا پہنچے۔

چنانچہ مجھے تقریر لکھنی پڑی۔ مجھے ایک لحاظ سے جندوڈے کا اسپیچ رائیٹر ہونے کا فخر حاصل تھا کیوں کہ جب وہ کسی نئے پراجیکٹ میں ہاتھ ڈالتا تھا تو تقریر مجھ سے لکھواتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ ادیبوں اور شاعروں کا بنیادی مصرف یہ ہے کہ ان سے مختلف موضوعات پر تقریریں لکھوائی جائیں تاکہ وہ حقیقی زندگی سے قریب رہ کر لکھیں اور یونہی الل ٹپ خیالوں کی وادیوں میں نہ پھرتے رہیں۔ آوارہ بھٹکنے پر ویسے بھی قانوناً مختلف سزائیں مقرر ہیں۔

دکان کے افتتاح کے موقعے پر چند افسردہ خاطر دکانداروں، دفتروں کو جاتے ہوئے بابوؤں، اسکول سے بھاگے ہوئے لڑکوں اور پھیری لگانے والوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر جندوڈا نے تالیوں کی گونج میں مجھے ہار پہنا کر ایک پلیٹ پیش کی۔ جس میں قینچی کے علاوہ چند چھوہارے بھی رکھے ہوئے تھے۔ قینچی اٹھا کر طے شدہ پروگرام کے مطابق کھچ سے میں نے فیتہ کاٹا۔ جندوڈا میرا ہاتھ پکڑ کر قریبی بند دکان کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور ہاتھ لہرا لہرا کر مجمعے کو روکنے لگا جو دکان کے اندر سجی ہوئی چائے کی پیالیوں۔ خستہ گرم پکوڑوں، سموسوں اور گلاب جامنوں کی طرف لپک رہا تھا۔

"ایک منٹ چین کے شہزادو! ایک منٹ۔۔"

وہ اپنی نئی واسکٹ کی جیب سے میری لکھی ہوئی تقریر نکالتے ہوئے بولا۔

"پہلے میری تقریر سنیں اس کے بعد چائے ملے گی"

جندوڈا اپنے سامنے ہجوم کو دیکھ کر ہمیشہ مچل جاتا ہے۔ لکھی ہوئی تقریر چھوڑ کر اچانک اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ

کہیں یہاں بھی وہ یہی عمل نہ دہرائے چنانچہ اس نے مجھے مایوس نہیں ہونے دیا عین وہی کچھ کیا جو اس سے متوقع تھا۔ پہلے تو وہ میری لکھی ہوئی تقریر پڑھتا رہا۔ درمیان میں لمبے لمبے وقفے ڈال کر مجمعے کو تالیاں بجانے کا موقع فراہم کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ آدھی تقریر پڑھی جا چکی ہے اور کسی نے ایک بھی تالی نہیں بجائی تو وہ مشتعل ہو گیا۔ لکھی ہوئی تقریر کو برگر کی طرح رول کر کے اپنے کولہے پر مارا اور دوسرے ہاتھ کا مکا ہوا میں لہرا کر بولا "میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت جمہوریت کا راستہ نہیں روک سکتی۔"

لوگ ہکا بکا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے اپنی کرسی عین اس کے پیچھے کھینچ لی اور آہستہ سے کہا ظالم یہ کیا کر رہا ہے"

جندوڈا حقارت سے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "کرائے کے پھوؤ۔ سامراجی ایجنٹو۔ تیسری دنیا کے قاتلو۔ امن کے دشمنوں' کان کھول کر سن لو کہ اب تمہاری دال نہیں گلے گی۔ نہیں گلے گی۔

مجمع نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

جندوڈا مزید جوش میں آگیا۔ کہنے لگا۔ اوئے کیکڑے۔ نام نہاد دانشور۔ تجھ میں عوام کا سامنا کرنے کی جرات نہیں اور مجھے چونڈیاں وڈ کر چپ کرا رہا ہے۔

میں گھبرا گیا۔ وفور ندامت سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ جندوڈا حسب عادت قابو سے باہر ہو گیا تھا اور اب براہ راست میری ذات پر حملہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے دفاع میں اس کی طرف کوئی خوشامدانہ' عاجزانہ فقرہ لڑھکاتا اس نے اچانک پلٹ کر مجھے گدی سے پکڑ کر مجمع کے سامنے کھڑا کر دیا۔ "یہ ہے میرا عظیم دانشور دوست۔ پروفیسر بی کے بٹالہ

لوگوں نے تالیاں بجائیں اور شیم شیم کے نعرے لگائے۔

ایک لڑکے نے اس موقع پر زور دار آواز سے پٹاخہ چلا دیا۔

جندوڈا نے جھٹ مجھے چھوڑ دیا اور آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ "کچھ دہشت گرد ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں اور افراتفری پھیلانا چاہتے ہیں میں انہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ جمہوریت کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کی ہر کوشش کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔ کیوں کہ مجھے معلوم کہ آپ جمہوریت چاہتے ہیں۔

"گھڑیاں ----- " میں نے جندوڈے کو لقمہ دیا۔

" ہاں گھڑیاں بھی --- " جندوڈا جیسے چونک کر بولا۔ " مجھے معلوم ہے کہ آپ جمہوریت سے پہلے گھڑی چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہوتا رہے کہ جمہوریت کس تاریخ کو آئے گی۔ کتنے بج کر کتنے منٹ پر آئے گی۔ "

" افوہ --- گھڑیاں --- " میں نے زچ ہو کر ٹھوکا دیا --- صرف گھڑیاں --- "

جندوڈا نے ایک لمبا سانس کھینچ کر میری طرف دیکھا۔

میں نے گھگھیا کر کہا --- " خدا کے لئے اب صرف کمپنی کا ذکر کر کے تقریر ختم کر دو --- "

جندوڈا واچ کمپنی " جندوڈے نے ہاتھ لہرا کر کہا " آپ کی اپنی کمپنی ہے۔ جس کی گھڑی خراب ہو۔ رعایتی دام پر ہم سے ٹھیک کرائے۔"

" گارنٹی ----- " میں نے جندوڈے کو یاد دلانا چاہا۔

مگر وہ اپنی رو میں تھا۔ کہنے لگا۔ " میں آپ کو یقین دلاتا ہوں بلکہ گارنٹی دیتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن جمہوریت کا سورج طلوع ہو کر رہے گا۔ "

یہ کہہ کر اس نے برگر بنائی ہوئی تقریر اس خیال سے دوبارہ کھولی کہ اقبال کے وہ اشعار یکے بعد دیگرے پڑھ ڈالے جو وہ اپنی تقریر کے دوران نہیں پڑھ سکا تھا مگر اتنی دیر میں ہجوم چائے کی پیالیوں پر ہلہ بول چکا تھا۔

تقریب کے اختتام پر جندوڈے نے مجھے مستری کے سے بطور خاص ملوایا۔ مستری کی بغل میں " کامیاب گھڑی ساز " کا نسخہ دبا ہوا تھا۔ " میں ساری

17

رات یہ کتاب پڑھتا رہا ہوں اور مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی کہ اس کے لکھنے کا مقصد کیا ہے۔ میرا دعوی ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر آدمی سائیکل مرمت کر سکتا ہے گھڑی مرمت نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو اللہ کو منظور"

اس دکان کے ایک پرانے کرم خوردہ شوکیس میں چند ٹوٹی پھوٹی گھڑیاں عجیب و غریب اوزار اور گھڑیوں کی پچاس سالہ پرانی تصویریں پڑی تھیں اٹھارہویں صدی کے اوائل کا ایک دیوار گیر کلاک دیوار سے چپکا ہوا تھا جس کے پنڈولم کی جگہ ہتھوڑی لٹک رہی تھی۔ اس زنگ آلود کلاک پر اگر ایک الو بٹھا دیا جاتا تو خوفناک فلمیں بنانے والا ہالی وڈ کا کوئی ادارہ ضرور فلم بندی کے لیے اس دکان کا چناؤ کر لیتا۔ ممکن ہے جندوڈے کو کسی کردار کی آفر بھی ہو جاتی۔

ان خیالات کا اظہار خود جندوڈے نے مجھ سے کیا۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا بھی شوق تھا۔

اگلے دن ساڑھے گیارہ بجے دن کو پہلا گاہک دکان میں داخل ہوا اس وقت جندوڈا مستری کے ساتھ کاؤنٹر پر بیٹھا دنیا کی بے ثباتی کا رونا رو رہا تھا اور میں اونچے اسٹول پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"آیئے آیئے جناب" جندوڈا اپنی نشست سے اٹھ کر ہاتھ ملتے ہوئے بولا "۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

گاہک نے ایک ناکارہ گھڑی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ بولا۔ "اسے ٹھیک کر دیں"

جندوڈے نے گھڑی مستری کے حوالے کر دی "مستری صاحب اسے خوب اچھی طرح چیک کریں اور اس کا فالٹ دور کریں"

مستری کے نے فوراً آنکھوں پر ڈھکن دار شیشہ چڑھایا۔ بڑی کدو کاوش سے گھڑی کو کھولا۔ مختلف اوزاروں سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "جناب! اس کے کتے فیل ہو گئے ہیں" "کیا مطلب؟"

گاہک نے حیرت سے باری باری ہم سب کا چہرہ دیکھا۔
" مطلب یہ ہے کہ اس کے کتے فیل ہو گئے ہیں " جندوڈے نے رک رک کر فقرہ ادا کیا۔ " اچھی نسل کے کتے ڈال کر ہم آپ کی گھڑی کو چالو کر دیں گے۔ کل لے جائیں "
" کل کتنے بجے " گاہک نے امید افزا نظروں سے جندوڈے کی طرف دیکھا
۔

۔ بج کر سینتالیس منٹ پر "
" اگر میں ذرا دیر سے پہنچوں " گاہک نے کہنا چاہا۔
جندوڈے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ہاتھ اٹھا کر بولا " وقت کی قدر کریں اور فالتو گفتگو سے پرہیز کریں "
گاہک بولا " اجرت کیا ہو گی "
جندوڈے نے شاہانہ انداز میں کہا " پچھتر روپے پچاس پیسے "
" کیا کہا پچھتر روپے پچاس پیسے ؟ " گاہک اچھل پڑا اتنی تو گھڑی کی بھی قیمت نہیں ہو گی۔ "
جندوڈا اپنی رو میں تھا۔ کہنے لگا۔ " اندازا کتنی ہو گی۔
گاہک نے چھٹ سے کہہ دیا " حد سے حد پچیس روپے۔
" ٹھیک ہے " جندوڈے نے دس کا ایک نوٹ اپنی جیب سے نکالا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا " پروفیسر بی کے بٹالہ --- پندرہ روپے گاہک کو دے دیں گھڑی کا سودا ہو چکا ہے۔ " یہ کہہ کر اس نے مجھے آنکھ ماری۔
میں نے طوعاً کرہاً پندرہ روپے نکالے۔ گاہک ہنسی خوشی نوٹ گنتا ہوا جیسے ہی دکان سے باہر نکلا۔ میں پھٹ پڑا۔ " یہ کیا حرکت تھی "
جندوڈا فاتحانہ قہقہ لگا کر کاؤنٹر سے باہر آیا۔ کہنے لگا۔ " چین کے شہزادے ! یہ کاروباری ٹوٹکے ہیں۔ اب یہ شخص جگہ جگہ اس سودے کا تذکرہ کرے گا۔ اس طرح کمپنی کی شہرت اشتہار دیئے بغیر بام عروج کو چھو لے گی۔ دوئم یہ کہ گھڑی اعلیٰ نسل کی ہے۔ اس حالت میں بھی چھبیس

روپے سے کم کی نہیں بکے گی۔ اس طرح کمپنی نے ایک روپے کا منافع کما لیا ہے۔ ویسے آج رات تم ڈیزرٹ ان میں میرے ایک دوست کی طرف سے میرے ساتھ ڈنر پر جا رہے ہو"

اس دن اور کوئی گاہک نہیں آیا۔ اگلے دن صبح ایک فیشن ایبل پریشان حال خاتون دکان میں داخل ہوئی۔ مستری کبا ابھی اپنی سیٹ پر نہیں پہنچا تھا۔ جندوڈا اچھل کر کاؤنٹر سے باہر آیا اور کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر خاتون کی طرف لپکا۔

آنکھ سے اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اخبار بینی ترک کر دوں اور خاموشی سے منظر سے نکل جاؤں۔ لیکن زمین اور اسٹول نے مل جل کر میرے ہلنے جلنے کی قوت مفلوج کر دی۔ میں سنی ان سنی کر کے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

خاتون نے اپنے ہونٹ گہری مسکراہٹ سے تر کر کے بڑی نغمگی سے کہا" آپ گھڑیاں بیچتے بھی ہیں

"کیوں نہیں --- کیوں نہیں" جندوڈا لہک کر بولا "کون سی گھڑی منگا کر نذر کروں"

خاتون ہنستے ہوئے بولی "جی نہیں شکریہ۔ مجھے گھڑی خریدنی نہیں، بیچنی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتاری اور کاؤنٹر پر رکھ دی۔ "میری بڑی بہن کا آپریشن ہونا ہے۔" خاتون نے کہنا شروع کیا "اور بہنوئی سرکاری دورے پر ہیں۔ مجبوراً --- بس کیا بتاؤں"

جندوڈے نے نظر اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا تک نہیں مسلسل خاتون کو دیکھتا رہا۔ بولا "آپ کے لیے چائے منگواؤں یا ٹھنڈا"

"میرے خیال میں چائے ٹھیک رہے گی" خاتون نے بڑی بے تکلفی سے کہا"

جندوڈے نے کاؤنٹر کا ایک گھومنے والا حصہ گھمایا۔ راستہ بنایا اور اندر داخل ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ "تشریف لائیں۔ غریب خانہ حاضر ہے"۔

یہ کاؤنٹر اتنا اونچا تھا کہ اس کے پیچھے دس افراد بھی زمانہ جنگ میں آسانی سے پناہ لے سکتے تھے۔ چونکہ امن کا زمانہ تھا اس لئے جندوڈے نے صرف ایک فرد کو پناہ دی۔ پھر وہیں سے اونچی آواز میں بولا۔ "میرے دوست عظیم وانشور۔ پروفیسر بی کے بٹالہ۔ اخبار پڑھ لیا؟"

"پڑھ لیا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

بہت اچھے" وہ ادھر سے چٹکی بجا کر بولا" اب آپ یوں کریں کہ اخبار ساتھ والے دکاندار کو واپس کر دیں اور سامنے چائے والے کو ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے آئیں۔ آتے ہوئے سموسے بھی لیتے آئیں۔

یہ سب کچھ میں نے کر تو دیا لیکن اس محفل میں واپس جا کر بیرے کا کردار ادا کرنے کو میرا دل نہ چاہا۔ چنانچہ میں گھر چلا گیا اور جاتے جاتے جندوڈے کے نام رقعہ لکھ کر چائے والے کو دے آیا کہ وہ چائے سے پہلے یہ رقعہ جندوڈے کی سرکار میں پیش کر دے۔ میں نے لکھا تھا۔

"تم نے ایک خاتون کے سامنے مجھے بیرے کا رول دے کر اچھا نہیں کیا۔ لہٰذا میں احتجاجاً واک آوٹ کرتا ہوں۔ تم پر اور تمہاری کمپنی پر ایک ہزار دو سو بتیس لعنتیں۔۔۔ دور کے منہ"

جندوڈے پر اس رقعے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے جلد از جلد اپنی رومانی اور کاروباری مصروفیات سمیٹ کر پہلی فرصت میں میرے دروازے پر دوستانہ حاضری دی۔ کہنے لگا۔ "چین کے شہزادے۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ جنوبی یمن کی شہزادی کے عشق میں ڈوب کر میں نے تمہاری شان میں گستاخی کر دی۔ میں اب تمہارے دربار سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

جندوڈے کو بے تکے محاورے بولنے اور بے موقع غلط اور وزن سے خارج بحر سے آزاد اشعار پڑھنے کی ایسی شاندار پریکٹس تھی کہ ذرا سا بٹن دباتے ہی رواں ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اسے اس قبیح فعل سے باز رکھنے کے لیے میں نے فوراً اس کے لئے غیر مشروط معافی کا اعلان کر دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ خاتون نے جندوڈے سے ایمرجنسی ایڈ کے طور پر پانچ صد روپے وصول کیے اور پتہ بتایا وہ غلط نکلا۔

"میں تصدیق کر چکا ہوں چین کے شہزادے" افسردہ و دلگیر جندوڈے نے کہا "اس نام کی کوئی خاتون کبھی اس محلے میں نہیں رہی۔ افسوس آج صبح کا ایک غلط معاشقے سے آغاز ہوا۔۔ خیر آئندہ سہی۔

علامہ نے اس موقعے پر کیا کہا ہے؟

میں نے کہا "علامہ کے ساتھ کبھی ایسی واردات نہیں ہوئی"

جندوڈے نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "تب پھر قوم یہ ذمہ داری تمہیں سونپتی ہے کہ اس دردناک سانحے پر قلم اٹھاؤ۔ اس واقعے کو پریس میں آنا چاہیے۔ بلکہ پریس ٹرسٹ میں آنا چاہیے۔"

اگلے دو تین دن بلکہ پورا ہفتہ موسم جندوڈا واچ کمپنی کے حق میں ناسازگار رہا۔ کوئی گاہک حتیٰ کہ عام واقف کار بھی دکان کی طرف نہیں پھٹکا۔ دسویں دن مستری کے نے فرم کے سامنے چارٹر آف ڈیمانڈ رکھ دیا۔ کہنے لگا۔ میری تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

"ضرور کیا جائے گا" جندوڈے نے فوراً کہا "شرط یہ ہے کہ دکان میں کوئی گاہک داخل ہو۔۔ کچھ گھڑیاں مرمت ہوں۔ کچھ اجرتیں وصول ہوں۔

مستری کیا کہنے لگا۔۔ "سائیکلوں کی دکان والے میرے پیچھے پڑے ہیں کہ میں غصہ تھوک دوں۔ لوٹ آؤں اور کام دوبارہ شروع کر دوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جندوڈے نے کیس میری طرف ریفر کر دیا۔ کہنے لگا "میرے دوست۔۔ عظیم دانشور۔۔ پروفیسر بی کے بٹالہ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟

مستری کیا جانے کس پرانی رنجش کی بنا پر مجھ سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ برہمی سے بولا۔ "پرائیویٹ نائٹ کالج کے اس پارٹ ٹائم پروفیسر کی بات پر نہ جانا۔ یہ تمہارا بیڑہ غرق کروا کر دم لے گا"

میری شان میں گستاخی ہوتے دیکھ کر جندوڈے سے صبر نہ ہو سکا۔ گرج کر بولا " او مکار کبڑے عاشق ۔۔ جعلی گھڑی ساز ۔۔ سامراجی ایجنٹ ۔۔ خبردار میرے عالم فاضل دوست کی شان میں مزید کوئی لفظ نہ کہنا "
مستری کب فوراً اپنا کب سنبھالتا ہوا نشست چھوڑ کر کاؤنٹر سے باہر آ گیا۔ کہنے لگا " ہونہہ ۔۔۔ عالم ۔۔۔۔ فاضل ۔۔۔ دنیا جانتی ہے کہ اس دغا باز کے پاس سوائے باتوں کے اور کچھ نہیں جندوڈے میری یہ بات نوٹ کر لو کہ تمہاری تباہی آوازیں دیتی ہوئی عنقریب تمہارے پاس پہنچ جائے گی "

یہ کہہ کر وہ تو کچھوے کی طرح رینگتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ البتہ میری ناک سے گھڑیاں درست کرنے والا ایک پیچ دار آلہ آ کر ٹکرایا۔ بعد میں جندوڈے نے معذرت کے ساتھ بتایا کہ یہ ہتھیار اس نے کسے کو نیست و نابود کرنے کے لیے پھینکا تھا جو نشانے کی ذرا سی غلطی سے دوست دشمن میں تمیز نہ کر سکا۔
اگلے دن میں ناک کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر جندوڈے کی دکان میں پہنچا تو وہ سر نیہوڑائے گہری سوچ میں غلطاں تھا۔
میں نے پوچھا " کیا ہوا "
کہنے لگا " چین کے شہزادے۔ اس دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے "۔
" دنیا سے یا دکان سے ؟ " میں نے فوری تصحیح کے لیے پوچھا۔
" دکان سے بھی تھوڑی سے ردو قدح کے بعد اس نے تسلیم کر لیا۔" جب تک کوئی اچھا مستری نہ ہو " وہ گہری سرد آہ بھر کر بولا۔ " گھڑیوں کی دکان کامیابی سے نہیں چل سکتی۔ خواہ وہ جندوڈا واچ کمپنی ہی کیوں نہ ہو
۔
" پھر کیا ارادے ہیں ؟ " میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا
۔
" کوئی اور نیا کاروبار دیکھتے ہیں " وہ دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا "

23

کوئی ایسا کاروبار ۔ جس میں چار پیسے ہاتھ آئیں ۔ ناموری ہو ۔ تعلقات بنیں ۔ مزے سے پجیرو جیپ میں گھومیں پھریں ۔ ایک باڈی گارڈ ہو جس کے کندھے پر کلاشنکوف ہو مونچھیں ہاتھ بھر لمبی ہوں ۔ سر پر " اتنا کہتے کہتے وہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا ۔ میں نے بھی گردن گھمائی ایک ٹخنی سا آدمی جسم سے بار بار ڈھلکنے والی پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے اندر داخل ہو رہا تھا ۔ اس کے پیچھے پولیس کا ایک سپاہی تھا ۔ ٹخنی آدمی نے بڑی مشکل سے ایک ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالا اور دیوار گیر زنگ آلود آسیبی کلاک کی طرف اشارہ کر کے بولا ۔۔۔ " وہ ہے میرا کلاک " ۔

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے پتلون سنبھالی ' دوسرے ہاتھ کو نیزے کی طرح کاؤنٹر پر کھڑا کر کے ایک جست میں کاؤنٹر پر چڑھ گیا ۔ وہاں بوٹ سمیت پتلون سنبھالے فل کلاک کی طرف لپکا ۔

اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ وال کلاک کی بڑھتا جندوڈے نے مٹھی میں اس کا ٹخنہ پکڑ کر جھٹکا دیا ۔ پتلون بردار اچھل کر فرش پر گرا اور کپڑے جھاڑ کر پتلون سنبھالتے ہوئے چنگھاڑا " ہائے بھائی صاحب میرا ٹخنہ ۔ ہڈی چور چور کر دی "

" آخر بات کیا ہے جناب " میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا ۔

" بات یہ ہے جناب بھائی صاحب " وہ کراہ کر بولا ۔ " پچھلے سال میرا یہ کلاک چوری ہو گیا تھا ۔ کل یہاں سے گزرتے ہوئے آہ میری نظر اس پر پڑی ۔۔ آہ ۔۔۔ آج میں نے پولیس کو اطلاع دے دی " ۔

" مگر یہ کلاک تو ڈیڑھ صدی پرانا ہے " میں نے جندوڈے کی حمایت میں پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا ۔ " اگر یہ پچھلے سال آپ کے استعمال میں ہوتا تو اس پر ڈیڑھ صدی کا زنگ نہ لگتا ۔ ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ۔ "

24

"کیسی غلط فہمی ---؟" پتلون بردار چیخ کر بولا --- "پورے شہر میں اس ماڈل کا کوئی کلاک نہیں ---"

جندوڈا اب میدان میں کود پڑا --- بولا --- "پورے شہر میں اس سے زیادہ ناکارہ اور نکما اور کوئی کلاک نہیں --- یہ دنیا کا بدترین اور انتہائی بے ہودہ کلاک ہے مگر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں اپنا کلاک واپس لینا چاہتا ہوں" پتلون بردار چنگھاڑ کر بولا۔

تو پھر وہ رقم مجھے دے دیں جو میں کباڑی کو دے کر یہ کلاک لایا ہوں" جندوڈا بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

اب تک سپاہی خاموش کھڑا تھا۔ معاملے کو بالا ہی بالا طے ہوتے دیکھ کر اس نے زور سے کھنکھار کر پہلے تو گلا صاف کیا۔ پھر درمیان میں آکر بولا "آپ لوگ تھانے چلیں جی --- وہیں معاملہ حل ہو گا۔"

تھانے کا نام سن کر جندوڈے کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم میرے کندھے کا سہارا لے کر بولا۔ "میرے دوست۔ چین کے شہزادے۔ عظیم دانشور۔ پروفیسر بی کے بٹالہ۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔"

سپاہی میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ بھی تھانے چلیں"

میں نے سپاہی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے ایک طرف لے گیا۔ کچھ خاطر مدارت کی۔ پھر عاجزی سے بولا۔ "خالو جان! آپ خود سوچیں کہ ایک دانشور بی کے بٹالہ کا تھانے میں کیا کام۔ نہ میں دکان کا مالک، نہ شیئر ہولڈر، نہ پارٹنر"۔

سپاہی مردم شناس تھا۔ کہنے لگا۔ "بات تو معقول ہے۔"

میں نے فرداً فرداً سپاہی اور پتلون برادر سے ہاتھ ملایا۔ ان کی انسان دوستی علم پروری اور ادب نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ پھر جندوڈے کی طرف مڑ کر بولا "تم تھانے چلو۔ میں ضمانت کا بندوبست کر کے ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے منظر سے غائب ہونے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی"

خدور تک جندوڈے کی آہ و بکا میرا پیچھا کرتی رہی " اوئے جنوبی یمن کے کیکڑے اوئے بحر منجمد شمالی کے اژدھے ۔ اوئے سمٹرا کے کچھوے ۔ اوئے تیرا بیڑہ تر جائے ۔ اوئے تیرا گھر نہ رہے ۔

اب لوگ مجھ پوچھتے ہیں کہ جندوڈا واچ کمپنی کی عبرت انگیز ناکامی کا سبب کیا ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیا جواب دوں ۔ سوالات کی تکرار سے تنگ آکر میں اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دیتا ہوں اور گہرے تاسف میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا ہوں اللہ کی مرضی "

کیا وقت ہوا ہے ؟

کچھ لوگوں کو بار بار گھڑی دیکھنے کی عادت ہوتی ہے اور کچھ کو بار بار وقت پوچھنے کی ۔ ایک طویل ' بیزار کن انگڑائی لے کر پہلے اپنی گھڑی دیکھیں گے پھر آسمان کا جائزہ لیں گے ۔ پھر آپ سے پوچھیں گے ۔ " کیا وقت ہوا ہے جی ؟ "

آپ جان چھڑانے کے لیے خود بھی ایک جمائی لیں گے ۔ جلدی سے کہیں گے ۔ " گیارہ بج کر تین منٹ ہوئے ہیں ۔ میرا خیال ہے اب اٹھنا چاہیے ۔ خاصی رات ہو چکی ہے ۔ "

وہ ایک اور طویل جمائی لے کر حیرت سے کہیں گے ۔ " گیارہ بج کر تیس منٹ ؟ کمال ہے ۔ ابھی تو خاصی رات باقی ہے ۔ بیٹھو تو سہی چلتے ہیں ۔ "

آپ پریشان ہو کر کہیں گے " نہیں اب چلنا چاہیے مجھے بہت کام کرنا ہے ۔ میرا خیال ہے اب چلنا ہی چاہیے ؟

وہ آپ کا بازو پکڑ کر بڑی اپنائیت سے پوچھیں گے ۔ " بھلا کیا کرنا ہے آپ کو ؟ "

آپ زچ ہو کر کہیں گے " خاصی لکھت پڑھت کرنی ہے مجھے ۔ اب اجازت دیں "

بھائی میرے " وہ آپ کا بازو مروڑ کر ازراہ تلطف آپ کی کمر سے لگاتے

ہوئے کہیں گے۔ "لکھنے پڑھنے کے لیے اللہ میاں نے دن بنایا ہے۔ رات صرف سونے یا باتیں کرنے کے لیے ہوتی ہے بیٹھیں ایک آدھ گھنٹہ پھر چلیں گے انشاء اللہ"

جتنی دیر آپ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہو رہیں وہ آپ کو بٹھاتے رہیں گے۔ جب آپ بیٹھ جائیں گے تو وہ کھڑے ہو کر ایک تھکی تھکی سی انگڑائی لیں گے۔ بیزاری سے پوچھیں گے "اور کیا حال ہے؟"

ایسے لوگ وقت صرف اس لئے پوچھتے ہیں تاکہ دوسروں کو احساس دلا سکیں کہ وقت بھی کوئی چیز ہے۔ یہ ساعتیں جو گزر رہی ہیں۔ ان کا بھی کوئی پیمانہ ہے۔ خود ان کے لیے وقت کی اہمیت صرف یہ ہوتی ہے کہ جب موضوع ختم ہو جائے یا بوریت بڑھ جائے تو بوجھل بوجھل سی فضا میں زندگی اور حرکت پیدا کرنے کے لیے ایک فقرہ لڑھکا دیں۔ "کیا وقت ہوا ہے جی"

سچ تو یہ ہے کہ عشاق، دفتر بابوؤں اور طلباء سے زیادہ وقت کیلئے کوئی متردد نہیں ہوتا۔ عاشق کو مقررہ وقت پر محبوب سے ملنا ہوتا ہے۔ اس لیے طے شدہ وقت میں وہ ایک منٹ کی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتا۔ راستے میں طوفان حائل ہوں یا ظالم سماج وہ کہیں نہیں رکتا۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ بگٹٹ اپنے ہدف کی طرف بھاگتا ہے۔ ساتھ ساتھ گھڑی دیکھتا جاتا ہے۔ مزید احتیاط کے لیے راہ گیروں اور دکانداروں سے وقت پوچھتا جاتا ہے۔ بابوؤں اور طلباء کے نقطۂ استفسار میں البتہ فرق ہے۔ بابو اس لیے وقت پوچھتے ہیں کہ بروقت دفتر پہنچ سکیں اور حاضری رجسٹر میں کراس نہ لگنے پائے۔ طلباء اس لئے وقت پوچھتے ہیں تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ مزید کتنی دیر بعد انہیں کالج پہنچنا ہے تاکہ ان کا ناپسندیدہ پیریڈ گذر جائے۔

دوران سفر وقت پوچھنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ آپ کے پاس اگر کوئی بے گھڑی شخص بیٹھا ہے تو وہ زبان کی بجائے ہاتھ کا استعمال اپنا حق

ہم سفری سمجھتا ہے بڑی بے تکلفی سے آپ کی کلائی تھام لیتا ہے۔ ہاتھ کو حسب منشاء سیدھا یا الٹا کرتا ہے.. بھوئیں سکیڑتا ہے۔ اف یا افوہ کی ایک تشویشناک آواز نکالتا ہے اور ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ چند لمحوں تک گزرتی ہوئی گاڑی سے رینگتے ہوئے مناظر دیکھتا ہے۔ پھر بڑے اطمینان سے آپ کی کلائی تھام لیتا ہے اور اس مرتبہ نظریں جما کر ڈائل پر حرکت کرنے والی سوئیوں کا معائنہ کرتا ہے ایک سرسری نظر آپ کے چہرے پر ڈالتا ہے۔ پھر اخلاقاً پوچھ لیتا ہے "یہ کون سی گھڑی ہے جی؟"

"سیکو فائیو" آپ ہم سفر کی مزید بے تکلفی سے بچنے کے لیے دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں۔

اگلا سوال عموماً غیر متوقع نہیں ہوتا۔ "آج کل کیا قیمت ہے جی اس کی؟"

آپ قیمت بتاتے ہیں۔ ہم سفر ہونٹ سکوڑ کر اوف کی آواز نکالتا ہے آپ سمجھتے ہیں وہ گھڑی کی قیمت سن کر سراسیمہ ہو گیا ہے۔ مگر وہ آپ کی خوش فہمی اچانک یہ کہہ کر رفع کر دیتا ہے "اوف۔۔ اتنی کم قیمت" ظاہر ہے گھڑی کی ناقدری آپ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آپ اپنے دفاع میں کہتے ہیں۔ میں نے آج سے سات سال پہلے کی قیمت بتائی ہے۔"

ہم سفر اس وار کو اپنی منطق کی ڈھال پر روک لیتا ہے۔۔ کہتا ہے جبھی تو میں حیران تھا کہ اس کی اتنی کم قیمت کیوں ہے۔ آج کل تو اس کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو اس وقت یہ گھڑی"

وہ اب بڑی لاپرواہی سے آپ کی کلائی تھام لیتا ہے "اس کنڈیشن میں حد سے حد۔۔۔ میرے خیال کے مطابق۔۔ تقریباً۔۔ اندازاً۔۔

آپ جلدی سے اپنی کلائی چھڑا کر دوسرے ہم سفر سے مخاطب ہونے کے لیے بہانہ ڈھونڈتے ہیں "پلیز۔۔ ذرا یہ کھڑکی بند کر دیں۔ ادھر ٹھنڈی

ہوا براہ راست آرہی ہے۔"

دوسرا ہم سفر آپ کی پریشانی سے قطعاً لاعلم، لاتعلق، بڑے اطمینان سے کہتا ہے "کھڑکی میں نے سگریٹ پینے کے لیے کھول رکھی ہے جناب! سگریٹ ختم ہو گی تو بند کر دوں گا۔ آپ محض پہلے ہم سفر کی باتوں سے بچنے کے لئے دوسرے ہم سفر سے مراسم کا آغاز کر دیتے ہیں "کون سی سگریٹ پی رہے ہیں؟"

"کنگ سائز فلٹر" جواب آتا ہے

آپ پہلے ہم سفر کو مکمل طور پر نظرانداز کرنے کے لئے خوش اخلاقی سے کہتے ہیں۔ "جبھی میں کہوں یہ اتنی بہترین خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔ کیا بات ہے اس کنگ سائز فلٹر کی"

نتیجہ حسب توقع برآمد ہوتا ہے پہلا ہم سفر آپ سے مایوس ہو کر کسی اور ہم سفر کی کلائی ڈھونڈتا ہے۔ دوسرا ہم سفر آپ کو بڑے احترام سے سگریٹ پیش کرتا ہے اور آپ کی خواہش کے بموجب کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ حالانکہ اب کھڑکی کھلی رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

بعض لوگوں کو صرف وقت پوچھنے سے غرض ہوتی ہے۔ اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ وقت پوچھنے کا یہ کون سا موقع اور کون سا مقام ہے۔ آپ بڑی عجلت میں ہیں انتہائی مصروف شاہراہ کا ٹریفک سگنل چند لمحوں کے لیے سرخ ہوتا ہے۔ آپ لپک جھپک سڑک پار کرنا چاہتے ہیں۔ سڑک کے بیچ میں پہنچتے ہیں کہ سامنے والا شخص گزرتے گزرتے پوچھتا ہے "کیا وقت ہوا ہے جی آپ تیزی سے گزرتے ہوئے آستین اونچی کرتے ہیں۔ کلائی سے قمیض کا کف اوپر اٹھاتے ہیں۔ ایک نظر گھڑی پر ڈالتے ہیں اور جواباً کہتے ہیں "بارہ پینتیس" مگر مخاطب آپ کا جواب سننے سے پہلے سڑک پار کر کے دوسری طرف جا چکا ہے۔

کسی کو آپ کے بتائے ہوئے وقت سے ہمدردی ہو تو آپ کی اشک شوئی کے لیے کہہ دیتا ہے "بارہ پینتیس؟ بلے بلے دیکھتے ہی دیکھتے دن گزر گیا

ہمارے ایک دوست کے ساتھ عجب اتفاق ہوا۔
ایک روز وہ بس سٹاپ پر کھڑے بڑی دیر سے اپنے روٹ کی بس کے انتظار کر رہے تھے کہ میک اپ میں ملفوف ایک خاتون نے آہستہ سے پوچھا "کیا وقت ہوا ہے؟"
انہوں نے جلدی سے کلائی اونچی کی۔ پھر ایک دم بوکھلا کر بولے "سوری میرے پاس گھڑی نہیں ہے"
وہ سرگوشی میں بولی "سو روپے کی گھڑی نہیں لے سکتے؟ چار چھ سو روپے کا سوٹ پہنے کھڑے ہیں۔ ہونہہ" کنجوس!
بعد میں وہ ہم سے شکوہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "دو باتوں کا گہرا قلق ہوا"
پوچھا "پہلی بات کون سی ہے"
کہنے لگے "افسوس یہ کہ اس نے سوٹ کی قیمت غلط لگائی"
اور دوسری بات؟
وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے "اب میں اسے کیسے بتاتا کہ نیک بخت سوٹ کی طرح گھڑی لنڈے سے نہیں ملتی"
بعض لوگ وقت بتانے میں بڑی دریا دلی سے کام لیتے ہیں۔ آپ پوچھیں نہ پوچھیں وہ آپ کو وقت بتا کے رہیں گے۔ عموماً ان کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کی ناقدری کا گلہ لے بیٹھتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی ساتھ رواں ہوتے جاتے ہیں "اب دیکھیے نا کیا زمانہ آگیا ہے۔ اس وقت دن کے گیارہ بج کر چھپن منٹ ہوئے ہیں مگر صاحب دیکھ رہے ہیں آپ ہر طرف دھند پھیلی ہوئی ہے لگتا ہے صبح کے چھ بجے ہیں۔ حالانکہ ہمارے زمانے میں صبح کے چھ رات کو دو بجے بج جاتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔"
یہ کہہ کر وہ باقاعدہ ایک خاص اہتمام سے گھڑی دیکھیں گے اور بلند اعلان

کریں گے۔
"یا اللہ خیر بارہ تو یہیں بج گئے"
جتنی دیر وہ آپ کے پاس موجود رہیں گے یا آپ ان کے پاس موجود رہیں گے وہ وقفے وقفے سے اعلان کرتے رہیں گے۔
"لو جی بارہ دس ہو گئے"
بج گئے جناب سوا بارہ"
"بارہ بیس پر سوئی جارہی ہے جی"
اچھا رب راکھا۔۔ ہم چلتے ہیں۔۔ بارہ بج کر اکتیس منٹ ہوئے ہیں"
کہتے ہیں ہجر کے مارے عاشق کے لیے وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی پھر بھی وہ رات کو بار بار بستر سے اٹھ کر پانی پیتا ہے۔ گھڑی دیکھتا ہے۔ ستارے گنتا ہے۔ چہل قدمی کرتا ہے۔ شاعر ہے تو خود غزل کہتا ہے ورنہ رفیع اور طلعت محمود کی گائی ہوئی غزلوں سے کام چلاتا ہے۔
اسے اگر وقت بتایا جائے تو پرواہ نہیں کرتا۔ ناک بھوں چڑھا کر صرف اتنا کہتا ہے۔ "اچھا" اس اچھا کو کبھی کبھی وہ سوالیہ بنا دیتا ہے۔
"اچھا۔۔۔ چھا؟"
اس سوالیہ انداز کا مطلب مخاطب کو یہ یقین دلانا ہوتا ہے کہ اس کا بتایا ہوا وقت اس تک پہنچ چکا ہے۔
جب عاشق کی بیزاری انتہاؤں کو چھو رہی ہو تو اسے وقت بتانے سے پرہیز کرنا چاہئے کیوں کہ جواباً وہ ایک کمزور سی آواز میں ٹالنے کے لیے کہتا ہے ۔۔۔ "اچھ ۔۔۔ چھا"

لاتوں کے بھوت

خلال اکبر آبادی اس ڈر سے مشاعروں میں نہیں جاتے تھے کہ کہیں مشہور نہ ہو جائیں لیکن حاسدوں، بداندیشوں اور بدقماشوں کی لعن طعن نے مجبور کر دیا کہ جان ہتھیلی پہ رکھ کر مشاعروں میں شرکت کریں اور اگر

شہرت جیسی نامراد اور ملعون شے مل جائے تو طوہا و کرہا اسے قبول کریں۔ ابتدا محلے پڑوس کے مشاعروں سے کی بعد ازاں مضافات کے مشاعروں میں جانے لگے۔ شروع شروع میں لوگ آپ سے مشاعروں میں شرکت کا معاوضہ طلب کرتے تھے بعد میں ازراہ ترحم ' زادراہ کے طور پر دس پانچ روپے دینے لگے۔ محکمہ ریلوے کی ملازمت کے دوران آپ نے بے شمار افسروں کی ترقیوں ' تبادلوں اور علالتوں پر نظمیں لکھیں۔ صرف یہ نہیں بلکہ ان کے بچوں کی تقریبات عقیقہ و ختنہ جات پر بھی حد درجہ دلگداز اور معرکہ آراء نظمیں لکھیں اور ترنم سے موقع واردات پر سنائیں۔ بڑی واہ واہ ہوتی اور آپ کو کثرت سے اس قسم کی محفلوں میں بلایا جانے لگا۔ آپ کے قریبی ادبی حریف قلیل سہارنپوری کے شاگرد تھے۔ حضرت علیل کو غزل گوئی کے علاوہ اور بھی کئی امراض لاحق تھے مثلاً قصیدہ گوئی ' ہجوگوئی ' بدیہہ گوئی۔ الغرض کوئی گوئی ایسی نہیں تھی جو آپ کی دستبرد سے محفوظ رہ سکی ہو۔ اس کے علاوہ آپ کو حقیقی امراض بھی لاحق تھے مثلاً نسیاں ' خفقان خلجان اور عدم اطمینان وغیرہ انھیں جب قلیل جیسا مختصر الوجود مہمل گو ' سعادت اور جاں نثار شاگرد ملا تو فوراً آغوش محبت وا فرمائی اور انھیں اپنی فرزندی اور شاگردی دونوں چنگلوں میں داب لیا۔ جتنا مہمل اور بے ربط کلام تھا سب عزیزم کی نذر کیا اس پر مزید ستم یہ کہ بیٹی بھی دی۔ اور بیٹی بھی ایسی کہ لاکھوں میں ایک چشم۔

بہرکیف ' ذکر قلیل و علیل اور ان کے افراد خانہ کا نہیں ' حضرت خلال اکبر آبادی کا ہے۔ خلال صاحب کو جب قلیل جیسا شاعرانہ کیل کانٹے سے لیس حریف ملا تو ان کی مٹی گم ہو گئی۔ فوراً کسی مضبوط استاد کی تلاش کو نکلے۔ اللہ کے فضل سے شہر میں بہت سے اساتذہ فن موجود تھے۔ دکانیں سجا کے بیٹھے تھے اور اس قسم کے پیٹنٹ منشور تیار کر رکھے تھے۔

فیس داخلہ در حلقہ تلامذہ : حسب استطاعت

نذرانہ برائے اصلاح غزل : حسب توفیق

معاوضہ فی غزل تیار شدہ : حسب معمول

معاوضہ فی غزل فرمائش شدہ : حسب دستور

چندہ برائے جلسہ طرح : حسب موسم

خلال صاحب نے جو بھی در کھٹکھٹایا تقریباً اسی سے ملتے جلتے نرخ نامہ نے جلوہ دکھایا۔ جی بہت گھبرایا۔ ناشاد، نامراد، آزردہ و دیگر، سر نیہوڑائے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ یکایک ایک ڈنڈا کسی نے کمر پر رسید فرمایا۔ اور گرج کر کہا "سب در آزما لیے۔ گھر کی طرف قدم بڑھا لیے۔ یہ نا سوچا کہ ابھی ایک استاد باقی ہے"

پلٹ کر دیکھا تو گروے لباس اور بھوری چھاجوں چھاج داڑھی میں ملبوس حضرت دھمال اکبر آبادی کھڑے تبسم فرما رہے تھے۔ دھمال صاحب نے پاکستان آکر شاعری کے علاوہ قوالی اور گتکے بازی میں بھی ٹانگ اڑا رکھی تھی۔ لہٰذا کمزور شعراء کی اکثریت نہ صرف ان سے بدکتی تھی بلکہ انھیں دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔ کسی استاد الشعراء کو بھی ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ کیونکہ وہ دم مارتے تھے۔ یہ ڈنڈا مارتے تھے۔

اندھے کو کیا چاہیے؟ دو آنکھیں! اور یہاں تو دو آنکھوں کے علاوہ ایک عدد داڑھی اور ڈنڈا بھی موجود تھا۔ خلال صاحب فوراً ان کے قدموں میں لوٹ گئے۔ وہیں پچھاڑیں کھائے اور ان کے ٹخنوں کی رگیں دبانے اور ناخن چبھانے لگے کہ للہ اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔ دھمال صاحب نے دو چار ڈنڈے ان کی پیٹھ پر رسید کیے اور انھیں اپنا شاگرد کہہ کر جان اور ٹانگ چھڑوائی بعد میں دیر تک اپنے ٹخنے سہلاتے اور دنیا کی بے ثباتی پر اشعار دہراتے رہے۔

علیل صاحب کو جب یہ اطلاع ملی کہ حضرت خلال، حضرت دھمال کو اپنی کلک پر لے آئے ہیں تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بارے، صندل کا شربت پیتے اور اپنے پاؤں کے تلوے سہلاتے خسر محترم حضرت علیل

سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک ہی سانس میں تمام ماجرا ان سے کہہ سنایا۔ حضرت علیل کو سانپ سونگھ گیا۔ دیر تک سر پکڑے بیٹھے رہے آخر ایک آہ سرد کھینچی اور کسی کے مصرعے میں اپنا مصرعہ پھینٹ کر یہ شعر بنایا

دل میں ہمارے خوف ' میاں کب کسی کا تھا
" سن کر جو پی گئے یہ مزہ مفلسی کا تھا !

اس کے بعد ڈیڑھ میل لمبی ایک اور آہ سرد کھینچی اور فرمایا " میاں ' اب تم محض کھلنڈرے شاعر ہی نہیں ' ماشاء اللہ میرے داماد بھی ہو۔ کچھ اپنے بال بچوں پر توجہ دو۔ ان کی یافت کا بندوبست کرو۔ شاعری نے ہمیں کیا دیا۔ جو تمھیں دے گی۔ چھوڑو یہ شعرو شاعری۔ آج کل گتکے اور بنوٹ کا زمانہ ہے۔ اپنا سر بچاؤ اور جان کی امان پاؤ "۔

یہ وعظ و نصیحت سن کر قلیل صاحب کا دل بیٹھ گیا۔ خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر آکر سارا غصہ بیوی پر نکالا جیسا کہ اکثر شوہر صاحبان کرتے ہیں پھر معافی مانگی جیسا کہ اچھے شوہر صاحبان کرتے ہیں مگر شاعری پھر بھی نہیں چھوڑی۔ دل ہی دل میں انتقام کے نت نئے طریقے سوچتے ' پان کھاتے اور پرانی زمینوں سے زیادہ پرانی غزلیں کہتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے خسر صاحب کے تخلص کا عملی نمونہ اور اپنے تخلص کی چلتی پھرتی روتی پیٹتی تصویر بن گئے۔ جو دیکھتا چچ چچ کرتا۔

ادھر خلال صاحب کے تیور دیکھنے کے لائق تھے۔ سبحان اللہ۔ حضرت دھمال کی صحبت میں آنے کے بعد سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ پہلے تو استاد کی تقلید میں گیروے رنگ کا لباس اپنایا پھر کپڑے دھونے والے ڈنڈے کو رنگ روغن کروا کے اس پہ پھول بوٹے بنوا کے اور ہوالشافی لکھوا کر ہر وقت ساتھ رکھنے لگے۔ جو دیکھتا سہم جاتا قبرستانوں میں بگڑ بگھے اور محلوں میں کتے آپ کو دیکھتے ہی دم دبا کر سٹک جاتے۔ مشاعروں میں شاعروں کا بھی کچھ یہ حال ہوتا۔ ہر چھوٹے بڑے شاعر کی یہی درخواست ہوتی کہ

حضور ' میرے بعد پڑھیئے گا۔ یہ سلسلہ کچھ ایسا دراز ہوا کہ بزرگ اساتذہ کو اپنی متوقع صدارتیں خطرے میں پڑتی نظر آنے لگیں۔ خلال صاحب کی سنیارٹی تیزی سے گراف لائن کاٹتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ اچانک بساط پلٹ گئی ایک مشاعرے میں عجب سین دیکھنے میں آیا۔ محفل زوروں پر تھی۔ حضرت خلال ڈنڈے کے ہمراہ زینت محفل تھے۔ تقریباً آدھے شاعر پڑھ چکے تھے اور اتنے ہی پڑھنے کے لیے کسمسا رہے تھے کہ اچانک اژدر لکھنوی کا نام پکارا گیا۔ یہ دھان پان سے نحیف و نزار دو نمبر کے شاعر تھے۔ کچھ دنوں سے ایک اوور کوٹ پہنے ہر محفل میں پائے جانے لگے تھے۔ بتوں نے سمجھایا کہ حضرت! گرمی کا زمانہ ہے اوور کوٹ اتار کے مشاعروں میں تشریف لایا کیجئے۔ حضرت کا ایک ہی جواب تھا " قبلہ باقی کیا رہ جائے گا؟ " تو جب ان صاحب کا نام پکارا گیا تو یہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ بڑے اطمینان سے خلال صاحب کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گرج دار آواز میں بولے " چلو میاں فٹا فٹ اٹھو اور ہم سے پہلے پڑھ آؤ۔ ورنہ فیصلہ دوسرے طریقے سے ہو گا "۔ یہ سننا تھا کہ ہر صاحب محفل کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ منہ فق ہو گئے۔ یا الٰہی ' خیر اب کیا ہو گا یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین۔

خلال صاحب ڈنڈا سنبھال کے اٹھے پھر ڈنڈا لہرا کے بولے " دوسرا طریقہ نکالیئے حضرت " اژدر لکھنوی نے بڑے اطمینان سے اوور کوٹ کے دائیں پہلو میں ہاتھ ڈالا۔ جب باہر کھینچا تو بتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ جو چیخ نہ سکے کھکھیانے لگے۔ حضرت اژدر کے ہاتھ میں گز بھر لمبا ' لہراتا ' بل کھاتا ' لپلپاتی ہوئی زبان نکالتا ' ایک عدد سانپ تھا۔ بلند آواز میں بولے۔ " حضرات گرامی! شاعری کے ساتھ ساتھ سانپ پالنے کا بھی ہمیں شوق ہے۔ یہ آدم خور سانپ ہم نے بڑی مشکلوں سے سدھایا ہے جسے اپنے ڈنڈے یا شاعری پر ناز ہو آکر مقابلہ کرے۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ کہ کس کی شاعری اور کس کا ہتھیار سینئر ہے۔ "

خلال صاحب جس تیزی سے اٹھے تھے سانپ کو دیکھ کر اس سے زیادہ تیزی دکھائی اور چار قدم پرے الٹی چھلانگ لگا کے ان شاعروں پر جا پڑے جو سہمے سمٹے اللہ توبہ کا ورد کر رہے تھے۔ اژدر صاحب سانپ کو تازیانے کی طرح لہراتے ہش ہش کرتے مزید آگے بڑھے اور ہاتھ بڑھا کر سانپ کو اس انداز سے اچکایا کہ وہ خلال صاحب کے کندھے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اژدر صاحب نے لہجے کو مزید خوفناک بنایا۔ گھمبیر آواز میں بولے۔ "دو منٹ کے اندر اندر ڈنڈا ایک طرف رکھیئے اور کھڑے ہو کر تہہ دل سے ان تمام شعرائے کرام سے معافی مانگیے جنھیں آپ ڈنڈے کے زور پر خود سے کمتر سمجھتے رہے ہیں اگر آپ نے ہماری درخواست پر عمل نہ کیا تو بخدا سانپ اچھال کر آپ پر پھینک دیں گے۔ ساری محفل گواہ ہے کہ ہماری درخواست میں ہمارا کوئی مفاد نہیں، ساری شاعر برادری کی عزت و آبرو کا معاملہ ہے" خلال صاحب پہلے تو منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے۔ پھر کسمسائے۔ ڈرتے ڈرتے اس کاندھے کو ہاتھ لگایا جو سانپ سے مس ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ پھر آہستہ سے ڈنڈا ایک طرف سرکایا خود کو شعرائے کرام کے درمیان سے برآمد کیا۔ لرزتے ہوئے اٹھے۔ کپکپاتے ہوئے بولے۔ تمام شاعر برادری کو میرا سلام قبول ہو"۔

"معذرت ۔۔ معذرت" ہر طرف سے آوازیں آئیں۔

اس پر حضرت خلال سٹپٹائے۔ کمزور سی آواز میں بولے "بعد از سلام معذرت بھی قبول فرمایئے"۔ یہ کہا اور ایک نظر اژدر اور ان کی ہاتھ میں بل کھاتے ہوئے سانپ پر اور دوسری نظر حاضرین پر ڈالی اور تیزی سے لپک جھپک جوتے بغل میں داب، توبہ توبہ کرتے ہوئے چمپت ہوئے۔ جب وہ دروازے سے نکل رہے تھے تو حضرت قلیل بیاض ٹوپی سنبھالے اندر آ رہے تھے۔ بڑے زوروں کی ٹکر ہوئی۔ دونوں دھڑام سے زمین پر گرے۔ حضرت قلیل نے دل ہی دل میں کہا "لیجیے صاحب۔ ظالم نے آج کھلم کھلا حملہ کر ہی دیا۔ اسی بات سے ہم ڈرتے تھے۔ اب خدا

جانے اٹھتے ہی یہ جلاد کونسا داؤ استعمال کرے گا۔" مگر ان کی توقع کے برعکس حضرت خلال نے لپک کر انھیں بڑی محبت سے اٹھا لیا۔ گلے ملتے ہوئے۔ "معاف کیجئے گا حضرت۔ ہم سے غلطی ہوئی۔"

اس دن کے بعد سے اردو شاعری حضرت خلال کی مزید غزلوں سے اور شاعری کی نازک کمریں مزید ڈنڈوں سے محفوظ ہو گئیں وہ دن اور آج کا دن کوئی ان کی منت خوشامد بھی کرے تو غزلیں نہیں سناتے۔ مشاعروں میں نہیں جاتے۔ ڈنڈے کے ساتھ نظر نہیں آتے۔ گیروا لباس ترک کر دیا ہے۔ جب کوئی شخص ان سے وجہ پوچھتا ہے تو ایک ہی جواب دیتے ہیں "معاف کیجئے گا حضرت۔ ہم سے غلطی ہوئی"۔

جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز

یہ جنوری کے اوائل کی ایک خنک رات تھی۔ میں اپنے شب خوابی کے لباس، بنیان اور جانگیے میں ملبوس لحاف اوڑھے شرلاک ہومز کے کارنامے پڑھ رہا تھا کہ اچانک بند دروازے کے بیچ میں ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے بڑی ٹیکنیکل مہارت سے زنجیر کو کنڈھے سے علیحدہ کیا۔ دروازہ کھولا اور ایک بھالو اندر داخل ہوا۔ بلاشبہ یہ جندوڈا تھا۔

اس نے تاتاریوں اور منگولوں والی ایک ڈھیلی ڈھالی فرغل اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں جنگلی بلے کی طرح چمک رہی تھیں اور نتھنے فرط جذبات اور سردی سے سرخ ہو رہے تھے۔

اندر آتے ہی اس نے مجھے گلے سے لگا لیا بلکہ فرغل میں ڈھانپ لیا۔ اس فرغل سے برفانی ریچھوں اور سنگھوں کی بو آ رہی تھی کہنے لگا۔ "چین کے شہزادے میرے دوست۔ عظیم دانشور۔ پروفیسر بی کے بٹالہ۔ میں نے تمہارے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔

میں نے فوراً اسے کرسی پیش کی اور مونگ پھلیوں کا لفافہ بھی۔

گنتی کی چند مونگ پھلیاں باقی رہ گئی تھیں۔
جندوڈا بڑے جوش میں تھا کہنے لگا " چین کے شہزادے ۔ اب میں جس پراجیکٹ میں ہاتھ ڈال رہا ہوں اس میں دولت اور شہرت ہماری منتظر ہے ۔ " یہ کہہ کر اس نے اپنے فرغل سے ایک ڈرامے کا مسودہ نکالا اور میرے سامنے لہرا کر کہنے لگا ۔ یہ مشہور مصنف الحاج بدرالدین سلجوقی کا ایک غیر مطبوعہ تاریخی اور ملبوساتی ڈرامہ ہے ۔ فٹافٹ اس کی نوک پلک زبان و بیان درست کرو اور اس میں گھوڑوں کی تعداد کم کر کے آدمیوں کی تعداد بڑھا دو ۔ کل شام ایک مقامی ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں اس ڈرامے کی سائیکلو سٹائل کاپیاں آرٹسٹوں میں تقسیم کر دی جائیں گی ۔ "
میں نے حیرت سے اسے دیکھا " دماغ تو نہیں چل گیا ہے ۔ کل تک تو میں اس بھاری بھرکم مسودے کو بمشکل پڑھ پاؤں گا ۔ "
" پڑھنے کی ضرورت نہیں " جندوڈا فیصلہ کن لہجے میں بولا " ہمارے ہاں کوئی چیز پڑھنے کا رواج نہیں ہے ۔ بس تمہیں ایک نظر اس مسودے پر ڈالنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ کہاں کہاں سے گھوڑے غائب کیے جا سکتے ہیں ۔ پہاڑ اور دریا ' بارش اور طوفان کے سین ۔ یہ مشکل معاملے بالکل گول کرنے پڑیں گے کیوں کہ جس اسٹیج پر یہ ڈرامہ پیش کیا جائے گا اس کی لمبائی کم ہے اور چوڑائی نہ ہونے کے برابر ہے ۔ "
یہ کہہ کر اس نے بھاری بھرکم مسودہ میری گود میں ڈال دیا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ ٹہلتے ٹہلتے رکا اور میری طرف مڑے بغیر دیوار سے مخاطب ہو کر بولا " چین کے شہزادے ۔ اس بات کا بطور خاص خیال رہے کہ اس ڈرامے کا مصنف جندوڈا ناچیز ہو گا ۔ مسودے پر تمہیں موٹے موٹے الفاظ میں لکھنا ہو گا ۔ تحریر و پیش کش ۔ جندوڈا "
میں نے کمزور سی آواز میں کہا " مصنف کے طور پر پروفیسر بی کے بٹالہ کا نام ہی مناسب رہے گا ۔ ۔ جندوڈا ایک غیر شاعرانہ اور غیر ڈرامائی نام ہے ۔ "

جندوڈا نے اچانک اپنا رخ میری طرف کر لیا۔ کہنے لگا۔ "میں تم سے متفق ہوں۔ مصنف کا نام جندوڈا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ جے ڈبلیو ہونا چاہئے تحریر و پیش کش جے ڈبلیو" یہ کہہ کر اس نے پھر دیوار کی طرف منہ کر لیا اور موٹی سی آواز میں اعلان کیا "تحریر و پیش کش جے ڈبلیو --- جے ڈبلیو --- جے --- ڈبلیو"

پھر جاتے جاتے اس نے انکشاف کیا۔ "یہ سب کچھ جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کے زیر اہتمام ہو گا۔ کل کی تقریب میں اسکرپٹس کی تقسیم سے پہلے تقسیم کار ادارے کے قیام اور مقاصد کا اعلان بھی کر دیا جائے گا"۔

حسب عادت مجھے گو مگو اور کش مکش کی حالت میں چھوڑ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور سوں سوں کرتا برفانی ریچھ کی طرح رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

میں نے ڈرامے کے مسودے کا جائزہ لیا۔ ڈیڑھ کلو وزنی اس دیمک زدہ سال خوردہ مسودے میں واقعی آدمی کم اور گھوڑے زیادہ تھے۔ جہاں گھوڑے کم پڑھ گئے مصنف نے طوفان بادوباراں بیچ میں شامل کر دیا۔ طوفان زور پکڑنے لگا تو سمندر اور پہاڑ آگئے۔ صاف ظاہر تھا کہ الحاج بدرالدین سلجوقی نے یہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے نہیں چھپوانے کے لیے لکھا تھا۔ جو کسی طرح جندوڈے کے ہاتھ لگ گیا۔

میں ساری رات مسودے میں سے گھوڑے اور طوفان، پہاڑ اور سمندر نکالتا رہا۔ صبح جب مرغ نے بانگ دی تو میدان صاف تھا۔ ڈیڑھ کلو کے مسودے میں اسٹیج کرنے کے لئے آدھ پاؤ مواد نکلا۔

جندوڈے کو بھی رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ چائے کا تھرموس اور بند مکھن کا لفافہ لیے صبح ہی صبح میرے پاس آدھمکا۔ صورت حال جان کر اسے گہرا صدمہ پہنچا۔ کہنے لگا "چین کے شہزادے۔ میرے دوست عظیم دانشور --- پروفیسر لی کے بٹالہ --- یہ تم نے کیا کیا۔ اتنے عظیم اور مشہور مصنف کی آفاقی تحریر پر رندہ پھیر دیا۔ سارے ڈرامے کا بیڑہ غرق

کر دیا۔ مجھے تباہ و برباد کر دیا اب میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔
میں نے ندامت سے کہا۔ افسوس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا
۔ البتہ اگر تم کہو تو میں اس میں اپنی طرف س کچھ اضافے کر دوں ؟
" للہ کچھ کرو " جندوڈا ہاتھ ملتے ہوئے بولا " اس میں کچھ رومانی سین ڈال
دو ۔۔۔ تلوار بازی اور بیت بازی کے سین داخل کر دو ۔۔۔ کچھ کرو
۔۔۔ شام تک اس کی کاپیاں تقسیم ہونی ہیں۔
میں نے ایک اور یجنل رائٹر کی شان سے کہا۔ " پھر ہمیں پورا ڈرامہ بدلنا
پڑے گا۔ پوری عمارت کا نقشہ دوبارہ تیار کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر
ہم اپنی مرضی کے دروازے اور کھڑکیاں تیار کر سکیں گے۔
جندوڈا ہاتھ کھڑا کر کے بولا " پہلے تم ناشتہ کرو۔ چائے پیو۔ اس کے بعد
مسودے کے ساتھ جو مزید سلوک تم کرنا چاہتے ہو کر لو۔۔ لیکن للہ تاخیر
نہ کرنا۔ بارہ بجے دن تک ڈرامہ کا مسودہ میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ
میں سلطان احمد بیدار تک پہنچا دوں ۔۔۔ یہ نوجوان محکمہ انہار میں جونیئر
کلرک ہے آج کل سائیکلو اسٹائل مشین اور دفتر کی اسٹیشنری اسی کی
تحویل میں رہتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چھٹی کر کے گھر چلا جائے اور شام
کی تقریب سبوتاژ ہو کر رہ جائے "
میں نے جلدی جلدی بند مکھن ختم کیا۔ چائے حلق سے اتاری اور کاغذ
قلم سنبھال کر کام میں جت گیا۔ جندوڈا اچک اچک کر میرے تیزی سے
چلتے ہوئے قلم کے نیچے کاغذ پر ابھرتی ہوئی سطروں کو گنتا اور سر دھنتا رہا۔
پھر جانے کب واپس چلا گیا۔
بارہ بجے دن تک میں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ یہ ایک ایسا ڈرامہ تیار ہوا تھا
جس میں تاریخ ' جغرافیہ ' عمرانیات ' اخلاقیات ' تلوار بازی ' عشق کی
شوریدہ سری ' حسن کی روائتی بے اعتنائی ' بے حجابی اور ڈھٹائی ' بیت
بازی اور کوئز کمپی ٹیشن بھی شامل تھا۔
اب ہر لحاظ سے یہ ایک معاشرتی ' اخلاقی اور اصلاحی ڈرامہ تھا۔ ٹھیک بارہ

بج کر نو منٹ پر جندوڈا چند مدقوق اور مشکوک قسم کر افراد کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا۔
میں نے ہاتھ سے وی کا نشان بنا کر اسے کام ختم ہونے کی اطلاع دی۔ جندوڈا جھوم اٹھا۔ مسودہ میرے ہاتھ سے چھین کر پہلے تو اس نے ہاتھ ہوا میں اس طرح لہرایا جیسے ہوائی جہاز کی لینڈنگ کے وقت ایئرپورٹ کا عملہ کرتا ہے۔ یا گنجان شہر کا کبوتر باز۔۔ پھر اس نے آپس میں ہمارا تعارف کرایا۔
"مسٹر مست قلندر ہاتھی۔ مشہور قوال۔ اور ان کے ساتھی"
مست قلندر ہاتھی نے مجھ سے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ ملایا اور بلغمی آواز میں کہنے لگا۔ "جندوڈا صاحب نے بتایا تھا کہ اس ڈرامے میں ایک زبردست پارٹ مجھے بھی ادا کرنا ہے۔ ذرا وہ پارٹ آپ مجھے پڑھ کر سنا دیں کیوں کہ بندہ ناچیز پڑھنے سے قاصر ہے۔"
میں سوالیہ نظروں سے جندوڈا کی طرف دیکھا۔
وہ جلدی سے آگے آگیا۔ کہنے لگا "چین کے شہزادے۔ یہ وہی مشہور قوال ہیں جو قوالی کے ذریعے ہیرو کو ہر مشکل سے نکال لیتے ہیں۔ رات ہی میں نے آپ سے ان کا خصوصی تذکرہ کیا تھا۔ اور تاکید کی تھی کہ ان کا سین زور دار ہونا چاہئے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے آنکھ ماری۔
میں نے فوراً کہا۔ "ہاتھی صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ عین اسٹیج پر بلا کر آپ کو سین سمجھا دیا جائے گا۔"
"کچھ پتہ تو چلے" مست قلندر ہاتھی پریشان ہو کر بولا "آخر مجھے کیا کرنا ہے"
میں نے کہا "دشمنوں نے ایک تہہ خانے میں ہیرو کو الٹا لٹکا کر اس کی مشکیں باندھ رکھی ہیں اور آپس میں اس کے قتل کے مختلف طریقوں پر صلاح مشورہ کر رہے ہیں کہ اچانک آپ اپنی پارٹی سمیت پہنچ جاتے ہیں اور قوالی شروع کر دیتے ہیں۔ دشمنوں کے دل پر قوالی کا اتنا گہرا اثر ہو

جاتا ہے " مست قلندر ہاتھی جھوم اٹھا۔ آگے بڑھ کر اس نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ کہنے لگا۔ " کیا زور دار آئیڈیا پیش کیا ہے۔ آپ نے ۔ قربان جاؤں۔ سارا ہال ہاں ہاں کرنے لگے گا "۔

جندوڈا بڑی عجلت میں تھا۔ مجھ سے کہنے لگا " چین کے شہزادے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ تم ٹھیک پانچ بجے اپنی بہترین پوشاک زیب تن کر کے ہوٹل پہنچ جانا۔ " پھر میرے کان سے اپنا منہ لگا کر بولا " ایک عدد تقریر بہت ضروری ہے۔ لکھ کر لے آنا۔ "

لکھ لکھ کر میری انگلیاں ٹیڑھی ہو رہی تھیں میں احتجاجاً کہا " اب تو ہفتے بھر تک میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا "

جندوڈا سرگوشی میں بولا " للہ ۔۔ پھڈا نہ ڈالو چین کے شہزادے آج شام کی تقریب کے بعد ڈرامے کی ہیروئن کے گھر تمہارا ڈنر ہے "۔

یہ کہہ کر مست قلندر ہاتھی اور ساتھیوں سمیت کر دروازے کا رخ کیا اور جاتے جاتے اونچی آواز میں بولا " ٹھیک پانچ بجے۔ بہترین پوشاک ۔۔۔ تقریر ۔۔۔ ہیروئن ۔۔۔ ڈنر ۔۔۔ خدا حافظ "

میں نے ٹھیک چار بجے شیو کی۔ مونچھوں کا ایک ایک بال قینچی سے درست کیا۔ خوشبودار صابن سے غسل کیا۔ زمانہ قدیم کا ایک سوٹ زیب تن کیا۔ جوتوں پر پالش کی اور سرخ ٹائی باندھ کر جب ہوٹل پہنچا تو پونے پانچ بجے تھے اور بینکوئٹ ہال بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

اگر ایک بیرہ لپک کر مجھے سنبھال نہ لیتا تو اس صدمے سے نڈھال ہو کر میرا بے ہوش ہونا یقینی تھا۔

بعد میں گھنی مونچھوں والے کرخت صورت آدمی نے بیرے کے پیچھے سے گردن نکالی۔ یہ منیجر تھا۔

میرے استفسار پر اس نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ " ہمارے ہوٹل کا دستور یہ ہے کہ ہم پارٹیوں سے ایڈوانس پہلے پکڑتے ہیں ہال بعد میں بک کرتے ہیں۔

جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز ہمیں اتنے کم پیسے دے رہی تھی کہ ہم آرٹ کی خدمت کرنے سے قاصر رہے۔ مجبوراً انہوں نے اپنا اجلاس شہر کے سب سے تھرڈ کلاس ہوٹل 'دی رائل وکٹری ہوٹل میں ارینج کر لیا ہے"
میں بھاگم بھاگ دی رائل وکٹری ہوٹل پہنچا۔ یہاں سب بیرے اور بلیاں 'کک اور منیجر اجلاس میں موجود تھے۔ دوسرے چہروں کو میں اچھی طرح دیکھ نہیں سکا کیوں کا ایک تو اس کمرے نما ہال میں بہت کم طاقت کے بلب جل رہے تھے۔ دوئم اس میں برقی رو بھی رک رک کر پہنچ رہی تھی۔
اس نیم تاریک پراسرار فضا میں جندوڈے نے اچانک میری گردن دبوچ لی۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ کہنے لگا چین کے شہزادے نکالو میری تقریر"
میں نے جلدی سے لکھی ہوئی تقریر اس کے حوالے کی۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا ایک تین ٹانگوں والی کرسی تک لے گیا اور دھکا دیتے ہوئے بولا۔" احتیاط سے بیٹھنا۔ ساتھ ہی ہیروئن تشریف رکھتی ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے باآواز بلند میری آمد کا اعلان کیا" خواتین و حضرات! مشہور فلاسفر۔ عظیم دانشور جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کے سیکرٹری اطلاعات۔ جناب پروفیسر بے کے بٹالہ"
زور زور سے تالیاں بجائی گئیں۔ ایک نرم سی کہنی میری پسلیوں میں چبھوئی گئی۔ غور سے دیکھا تو یہ ہیروئن تھیں۔ زرق برق لباس میں ملبوس۔ میک اپ میں ڈوبا ہوا چہرہ۔ پینتالیس چھیالیس سالہ دوشیزہ۔
ابتدائی رسمی تقریریں ہو چکی تھیں۔ اب جندوڈے کا خطاب باقی تھا لہٰذا اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تقریر نکالی اور اپنی نشست سے اٹھ کر ناکافی روشنی میں اٹک اٹک کر تقریر پڑھنے لگا۔ بیچ بیچ میں وہ مجھ سے پوچھتا بھی گیا۔" یہ کون سا لفظ ہے چین کے شہزادے یہ کون سا فقرہ ہے۔ آگے کیا لکھا ہے۔ صاف کیوں نہیں لکھا۔

جب کسی بھی طرح تقریر میں روانی اور تسلسل قائم نہ ہو سکا اور اکتائے ہوئے حاضرین اور بلیاں جمائیاں لینے لگے تو جندوڈے نے حسب عادت تقریر کو ادھورا کیا اور برگر کی شکل دے کر فضا میں لہرایا۔ گلے کی رگیں پھلائیں اور اچانک پنگھاڑ کر بولا " دنیا کی کوئی طاقت ہم سے ایٹم بم بنانے کا حق نہیں چھین سکتی "

لوگ اپنی اپنی نشستوں پر سنبھل بیٹھے اور ہکا بکا ہو کر جندوڈے کا منہ دیکھنے لگے۔ جندوڈے نے لوگوں کو ذوق شوق سے اپنی طرف متوجہ پایا تو ایک دھماکے سے اپنے کرسی کو لات مار کر پرے پھینکا اور میز پر مکا مار کر بولا۔ " ہم گندم نہیں اگائیں گے مگر ایٹم بم بنائیں گے۔ جتنے کسان مزدور اور محنت کش ہیں ہم سب کو ان کے کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں اور فیکٹریوں سے نکال کر ہم اس کام پر لگا دیں گے۔ بے شک گندم نہیں اگتی تو نہ اگے۔ مگر ایٹم بم ضرور بننا چاہیے۔۔ ضرور بننا چاہیے۔ ضرور بننا چاہیے " آخری فقرہ کہتے کہتے اس نے مست قلندر ہاتھی کو گریبان سے پکڑ کر اونچا اٹھاتے ہوئے کہا۔ " اس ایٹم بم میں فیوز لگانے کے لیے جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کی طرف سے مست قلندر ہاتھی کی خدمات حاضر ہیں، " لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

مست قلندر ہاتھی گھبرا کر اونچی آواز میں تردید کرتے ہوئے بولا " میں نے کوئی غلط کام نہیں کرنا جناب صرف قوالی گانی ہے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔ آپ مجھے ایٹم بم وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالیں۔ صاف جواب ہے "

خلاف توقع جندوڈے نے اس سے ایٹم بم کا فیوز لگوانے پر اصرار نہیں کیا۔ چونکہ بلیاں تقریر کی طوالت سے اکتا کر میزوں پر مٹر گشت کرنے لگی تھیں۔ لہٰذا صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے جندوڈا جلد ہی موضوع کی طرف لوٹ آیا اور میز پر مکہ مار کر بولا " جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کی جانب سے پیش کرتے ہیں جے ڈبلیو اپنا بین الاقوامی تاریخی، سماجی اور

رومان سے لبریز ڈرامہ " انکھیوں کے جھروکوں سے " اس پر لوگوں نے میزیں پیٹ پیٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ حاضرین میں رائل وکٹری ہوٹل کا ٹھگنا اور بھینگا منیجر بھی شامل تھا۔ وہ یک لخت بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ " اب آپ نے جو کچھ کرنا ہے سات منٹ کے اندر اندر کر لیں کیوں کہ لوڈ شیڈنگ کا وقت ہونے والا ہے۔ "

جندوڈے نے قہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگا۔ " یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ بہر حال آرٹ کی خدمت اندھیرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوڈشیڈنگ کی فکر نہ کریں اور بغیر اجازت بیچ میں مت بولیں "

اس کے بعد آرٹسٹوں میں اسکرپٹ تقسیم کیے گئے اور سب چائے کی میزوں پر ٹوٹ پڑے۔ بلیوں نے بھی اس معاملے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور بیروں نے بھی خود کو تقریب کے مدعوئین میں شامل کر لیا۔

طے پایا کہ اگلے دن سے اسی ہوٹل کے کمرے میں ریہرسل ہوا کرے گی۔ انتظامیہ کو اس پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیوں کہ انتظامیہ کا سربراہ ٹھگنا منیجر اس ڈرامے میں بحری قزاق کا رول ادا کر رہا تھا۔

تقریب کے اختتام پر جندوڈے نے مجھے الگ بلایا۔ کہنے لگا " میں تو ہیروئن کو چھوڑنے اس کے گھر تک جا رہا ہوں تم ہوٹل کی پے منٹ کر کے اپنے گھر چلے جانا۔ انشاء اللہ رات کو ملاقات ہو گی "

میں نے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر اسے اس کا وعدہ یاد دلایا کہ تقریب کے بعد ہیروئن کے گھر متوقع ڈنر میں میری شمولیت کا کیا بنے گا؟

کہنے لگا " چین کے شہزادے ۔۔ جلدی مت کرو۔ سبھی پکے سو میٹھا ہو۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ ہوٹل کا بل ادا کر دینا۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔ اچھا خدا حافظ "

یہ کہہ کر وہ تو ہیروئن کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ مجھے بیروں اور منیجر نے گھیر لیا۔ چائے اور اس کے لوازمات کے

علاوہ ٹوٹی ہوئی پلیٹوں اور پیالیوں کا حساب بھی میرے آگے رکھ دیا گیا۔ طوہاً و کرہاً میں نے بل ادا کیا۔ طبیعت سخت بدمزہ ہوئی۔ سوچا اب کیا کرنا چاہئے۔ کچھ سمجھ نہ آیا۔ دل ہی دل میں جندوڈے کو صلواتیں سناتا ہوا گھر آگیا اور لحاف میں دبک کر شرلاک ہومز کے کارنامے پڑھنے لگا۔ رات کے دو بجے جندوڈے کا ہاتھ دروازے کے اندر داخل ہوا۔ اس نے آہستگی سے زنجیر کو کنڈھے سے علیحدہ کیا اور اندر آکر اسپینش بل فائٹروں کی طرح میری طرف بڑھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور یک لخت مجھ سے لپٹ گیا۔ بڑی جوشیلی آواز میں بولا۔

چین کے شہزادے۔ میرے دوست۔ عظیم دانشور۔ پروفیسر بی کے بٹالہ! میں اور میرے بزرگوں کی روحیں تمہاری عظمت کو سلام کرتی ہیں۔ ذرا یہ ڈرامہ اسٹیج ہو لینے دو۔ اس کے بعد تمہاری پائی پائی کا حساب بے باق کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ ایک رولز رائس تمہارے قبضے میں ہوگی۔ سنٹرلی ایئرکنڈیشنڈ۔ ویل فرنیشڈ بنگلے کی چابی تمہارے ہاتھ میں ہو گی۔ تمہارے دشمن اپنے اپنے بلوں میں منہ چھپائے سسک رہے ہوں گے اور اس ملک کے مشہور فلم ساز اور ہدایت کار اپنی اپنی فلموں کی کہانیوں کے لئے تمہاری منتیں کر رہے ہوں گے مگر مجھے یقین ہے کہ شہرت اور مقبولیت کی اتنی بلندیوں پر پہنچ جانے کے باوجود تم جندوڈے کو فراموش نہیں کرو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں نے اس سے دوستانہ مصافحہ کیا اور بل کی ادائیگی کے غم کو چند لمحوں کے لیے فراموش کر دیا۔ اگلے دن سے رائل وکٹری ہوٹل کے ایک نیم تاریک کمرے میں ڈرامے کی ریہرسلیں شروع ہو گئیں۔ جندوڈے نے بحری قزاق منیجر کی اجازت سے اس کمرے کے باہر ایک بورڈ بھی آویزاں کر دیا۔ "جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز"

اس کے بعد وہ ایک مرجھائے ہوئے نوجوان کو پکڑ لایا جس کے ایک ہاتھ میں سفیدی پھیرنے والی کوچی اور دوسرے میں ایک ڈول تھا۔

جندوڈا نے تعارف کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ ہے وہ مشہور و معروف ہستی جس کے آرٹ سے شہر کی کوئی دیوار محفوظ نہیں۔ مسٹر اللہ رکھا پینٹر اینڈ آرٹسٹ"

اللہ رکھا پینٹر اینڈ آرٹسٹ نے ہاتھ کے بجائے مجھ سے کہنی ملائی کیوں کہ اس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔

جندوڈا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چین کے شہزادے۔ اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر میرے ڈرامے کا اشتہار لکھ کر آرٹسٹ کے حوالے کرو۔ اگلے دن تم یہ دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گے کہ شہر کی سبھی دیواریں ہمارے اشتہارات سے جگمگا رہی ہیں۔ بس پھر دیر کس بات کی۔ اٹھو اور میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔ ہاں پروڈکشن انچارج کی حیثیت سے اپنا نام نیچے کسی کونے میں بے شک لکھ دینا۔"

جب تک میں نے اشتہار کا مضمون بنا نہ لیا جندوڈا میرے سر پر مسلط رہا اشتہار تیار ہو گیا تو اس نے میرے ہاتھ سے جھپٹ کر قلم لے لیا اور مختلف ناموں کو اوپر نیچے کرنے لگا۔ اس کاروائی سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔ "اس اشتہار کے نمودار ہوتے ہی عامل کامل نجومیوں اور انٹرنیشنل حکیموں کے اشتہارات کی ریڈر شپ یک سر ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ لوگ ایک جیسے اشتہار دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہیں۔ اب ورائٹی چاہتے ہیں"

ابتدائی تین چار دنوں کی ریہرسلیں میں نہیں دیکھ سکا کیوں کہ جو وقت ریہرسل کا تھا وہی میرے نائٹ کالج کا تھا۔ البتہ ایک دو چھٹیاں درمیان میں اکٹھی آجانے کے باعث مجھے ریہرسلیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔

رائل وکٹری ہوٹل کے جس کمرے میں ریہرسل ہو رہی تھی وہاں روشنی کا انتظام انتہائی ناکارہ تھا۔ کمرے کی دیواریں سیلن زدہ تھیں اور کھڑکیوں کے پردے سترھویں صدی عیسوی کی یادگار معلوم ہوتے تھے۔ بلیاں اور بیرے شروع سے آخر تک میاؤں میاؤں کرتے تھے۔ جندوڈا ہدایت کار

ہی نہیں اس ڈرامے کا ہیرو بھی تھا۔ اس کا انکشاف ریہرسل دیکھ کر ہوا ۔ وہ فرغل پہنے ' پھندنے والی اونی ٹوپی اوڑھے ہاتھ میں چھڑی پکڑے ہدایات بھی جاری کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اداکاری بھی کر رہا تھا۔
جو رومانی سین مسودے میں تحریر نہیں کیا گیا تھا اس کی ریہرسل اس وقت ہو رہی تھی ۔ جندوڈا ہیروئن کو سمجھا رہا تھا " میں جھاڑیوں سے نکل کر آپ کو دیکھتا ہوں ۔ آپ حیرت اور خوشی کے مارے بھاگ کر زور سے مجھ سے لپٹ جاتی ہیں ۔ اسی وقت بیک گراؤنڈ میوزک شروع ہو جاتا ہے ۔ یہ کہہ کے جندوڈا چند قدم پیچھے ہٹا اور چھڑی اس نے کسی کے سر پر رسید کی ۔ یہ مست قلندر ہاتھی کا سر تھا۔ اس نے بلبلا کر ہارمونیم پر انگلیاں چلا کر ہیرو کی آمد کا سماں باندھنے والے سر ملائے ۔
جندوڈا ایک دم وکٹ کیپروں کی طرح اکڑوں کھڑا ہو گیا ۔ بڑے نپے تلے قدم رکھتا جاپانی پہلوانوں کی طرح دونوں ہاتھوں کو گردش دیتا ہوا آگے بڑھا ۔ اس وقت وہ مجھے معمول سے زیادہ ہونق نظر آیا ۔ وہ جھاڑیوں سے نکلنے کی اداکاری کر رہا تھا لیکن اس کے ہر عمل اور ہر جنبش سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مرغی کو ڈربے میں بند کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے ۔ ہیروئن دور کھڑی لاتعلقی سے اپنے ناخن چبا رہی تھی ۔
جندوڈے نے زور سے کہا " ایکشن "
ہیروئن ٹھس رہی ۔ پھر بڑی بے دلی اور بھونڈے پن سے چلتی ہوئی ہیروئن جندوڈے کی طرف بڑھی ۔ اس کے چہرے سے کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوا ۔ البتہ وہ جندوڈے کے گلے سے ضرور لگ گئی ۔
مست قلندر ہاتھی اور اس کے ساتھی زور شور سے بیک گراؤنڈ میوزک دینے لگے ۔ ساتھ ہی دیگر آرٹسٹوں نے سیٹیاں بجانی شروع کیں ۔ کافی دیر تک ہیرو اور ہیروئن برسوں کے بچھڑے ہوئے محبوبوں کی طرح موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور آپس میں کانا پوسی کرتے رہے ۔
جندوڈے نے اعلان کیا کہ یہ سین اس وقت تک دہرایا جائے گا ۔ تا وقتیکہ

ہیروئن نیچرل ایکٹنگ کرنے لگے۔
چنانچہ ایک مرتبہ پھر جندوڈے نے وکٹ کیپنگ شروع کر دی۔ ابھی ہیروئن اس سے ایک آدھ انچ کے فاصلے پر تھی کہ اچانک کھلے دروازے سے ایک زرد رو اور بیمار شخص مونچھوں اور مکمل بدحواسیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا اور چنگھاڑ کر بولا۔ "نی شریفاں"
ہیروئن ایک دم سہم کر پرے جا پڑی جندوڈا بھی کچھ حیران کچھ پریشان نظر آیا۔ پہلی مرتبہ میں نے اس کے چہرے پر حقیقی جذبات کی جھلک دیکھی بے شک وہ اعلیٰ درجے کا اداکار بن سکتا تھا۔
سفید مونچھوں والے کی آمد کو میں خاصی دیر تک ڈرامے کا حصہ سمجھتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ سین تو میرے قلم کے نیچے سے گزرا تک نہیں پھر عملی طور پر کیسے پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا جندوڈا نے تحریر کے محاذ پر بھی مجھے شکست دینے کی ٹھان لی ہے؟
مگر جلد ہی میری غلط فہمی رفع ہو گئی۔ سفید مونچھوں والا شخص ہیروئن کا حقیقی شوہر تھا اور بڑی مشکلوں سے اسے ڈھونڈتا یہاں پہنچا تھا اور شکوہ کناں تھا کہ اس کی بیوی اس کے بار بار منع کرنے کے باوجود ان ڈرامہ بازیوں سے باز نہیں آتی۔
"آج فیصلہ ہو کر رہے گا" سفید مونچھوں والے نے گرج کر کہا۔
ہیروئن کے لہجے اور ایکشن میں یکایک برقی رو دوڑ گئی۔ چیخ کر ترکی بہ ترکی بولی "تو کیا فیصلہ کرے گا بابے ۔۔۔ فیصلہ تو میں نے کرنا ہے"۔
"کیا فیصلہ کرنا ہے؟ ایک دم سفید مونچھوں والے کا لہجہ ڈھیما ہو گیا۔ وہ مفاہمت بلکہ خوشامد پر اترتا نظر آیا۔
"فیصلہ کرنا ہے تو مجھے فارغ کر ۔۔۔" عشوہ طراز حسینہ نے چیخ کر کہا۔
"فٹافٹ۔ ابھی اور اسی وقت ۔۔۔ تو نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ میں تنگ آچکی ہوں تجھ سے۔ لعنت بھیجتی ہوں تجھ پر۔ پھٹکار تیرے منہ پر"

جندوڈا نے جو معاملات کو حد درجے نازک ہوتے دیکھا تو صلح صفائی کے لئے بیچ میں کود پڑا۔ بولا ۔۔ بزرگو ۔۔۔ میری بات سنیں "
"کیا کہا ۔۔۔ کیا کہا ۔۔۔" سفید مونچھوں والا سیخ پا ہو کر بولا ۔۔ "بزرگو ۔۔۔ مجھے بزرگ کہہ دیا ۔۔" مجھے بوڑھا بنا دیا۔ اب یقین آگیا کہ میری بیوی کو ورغلانے میں سب سے پہلے تیرا ہاتھ ہے "
اس براہ حملے پر جندوڈے کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن فرط جذبات میں ہونٹ کھینچ کر رہ گئے۔
میں نے سفید مونچھوں والے کو پکڑ کر ایک طرف کیا اور اسے سمجھایا کہ ہوٹلوں اور ریہرسل روموں میں ازدواجی جھگڑے نہیں نمٹائے جا سکتے۔ وہ کچھ عقل سے کام لے اور صبر و تحمل سے اپنی بیوی کو لے کر گھر چلا جائے۔ میری اس تجویز پر جندوڈے نے اچانک بل کھا کر کہا۔ " اور میری ایڈوانس رقم کا کیا بنے گا چین کے شہزادے ؟
" کتنی بنتی ہے تمہاری رقم ؟ " سفید مونچھوں والے نے تاؤ کھا کر پوچھا۔
" جتنی بھی ہو تمہیں کیا ؟ " جندوڈا چیخ کر بولا " جاتے ہو یہاں سے یا آجاؤں اپنے اصلی روپ میں "
سفید مونچھوں والا جندوڈے کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ بظاہر بڑی خوش اخلاقی سے بولا " اچھا بھائی صاحب آپ کی مرضی " یہ کہہ کر وہ ڈولتا ڈگمگاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک بلی سوئی پڑی تھی۔ اس کی دم سفید مونچھوں والے کے پاؤں تلے آئی تو بلی نے بیدار ہو کر پوری قوت سے میاؤں کی ایک جگر خراش آواز نکالی اور اس کی پنڈلی پر اس مہارت سے ایک پنجہ رسید کیا کہ نیکن کے لیے پتلون کا چھ سات انچ کپڑا بآسانی نکل آیا۔
سفید مونچھوں والے کی عبرت ناک روانگی کے بعد جندوڈا نے فوراً ریہرسل کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور ہیروئن کو رکشہ کا کرایہ ادا کر کے تاکید کی کہ وہ اپنے شوہر سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اس کو سمجھا بجھا کر کل

مقررہ وقت پر ریہرسل کے لئے آجائے۔ پھر دیر تک جندوڈا' میرے اور بجری قزاق منیجر کے ساتھ چائے کی میز پر بیٹھ کر حالیہ واقعے پر گفتگو کرتا رہا ۔ وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ خاتون آرٹسٹ نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے چوری چھپے آرٹ کی خدمت کر رہی ہے۔

" فرض کریں اگر وہ آپ کو پہلے بتا دیتی تو " بجری قزاق نے کہا۔ " پھر آپ کیا کرتے

" پھر میں اس کے شوہر کو ڈرامے کا پروڈکشن انچارج بنا دیتا " ۔ جندوڈے نے فوراً کہا " دراصل اس قسم کے شوہر اپنی بیویوں کی مقبولیت سے جلتے ہیں ۔ انہیں ٹھنڈا رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں کسی کام میں الجھا دیا جائے کوئی بلغارین بادشاہت سونپ دی جائے۔

بجری قزاق پر تشویش لہجے میں بولا ۔ " ڈائریکٹر صاحب بات یہ ہے کہ میرے مالکان غیر ملک میں ہوتے ہیں اور انہوں نے سارا کاروبار مجھے سونپ رکھا ہے ۔ اب تک کوئی پھڈا نہیں ہوا ۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے ڈرامے کی وجہ سے کل کلاں "

جندوڈا نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ بولا " بجری قزاق کو اتنا بزدل میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ زندگی میں ایسے معمولی واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہئے ۔ میرے وائی کنگ ۔ منہ رکھ

ہوٹل سے واپسی پر میں نے تنہائی پا کر جندوڈے سے اپنے دل کی بات کہہ دی " میرے خیال میں کچھ دنوں کے لیے ریہرسل ملتوی کر دو اور کوئی ایسی ہیروئن ڈھونڈو جو شوہر اور گھر کی قید سے آزاد ہو۔

جندوڈے نے میری دونوں تجویزیں رد کر دیں ۔ کہنے لگا " اول تو ریہرسل ملتوی نہیں ہو سکتی کیوں کہ شہر کی سب آرٹ کونسلوں کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہم ناکام ہو جائیں ۔ دوئم یہ کہ تمہاری بیان کردہ ہیروئن صرف ہالی وڈ میں مل سکتی ہے اور فی الحال میں ہالی وڈ نہیں جا سکتا " پھر اس نے مجھے سرزنش کرتے ہوئے گھور کر کہا۔ "

میرے چین کے شہزادے ۔ بزدل اور ڈرپوک فلاسفر ۔۔ عظیم دانشور پروفیسر بی کے بٹالہ ۔۔ تمہاری مثال اس چوہے جیسی ہے جو شدید بھوک کے عالم میں بھی کسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے کی طرف یہ سوچ کر نہیں بڑھتا کہ کیا معلوم اس میں کھٹکا لگا ہو ۔ تم پرلے سرے کے مایوس العلاج مریض ہو اور تمہارا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں " یہ کہہ کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا ۔

اگلے روز جو میں ریہرسل روم پہنچا تو دیکھا کہ ریہرسل زور شور سے ہو رہی ہے اور دور دور تک ظالم سماج یا سفید مونچھوں والے کا نام و نشان تک نہیں ۔ مست قلندر ہاتھی کے بارے میں جندوڈے نے بتایا کہ اسے مستقل پور جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کا میوزک ڈائریکٹر بنا دیا گیا ہے اور اس کے تمام ساتھیوں کو اسسٹنٹ ڈائریکٹروں کے عہدوں پر ترقی دے دی گئی ہے ۔

ہاتھی اور اس کے ساتھی موقع و محل کا انتظار کیے بغیر طبلے ' سارنگی ' چمٹے اور کھڑاؤں سے تال دے رہے تھے ۔ ہیوئن ٹانگ پر ٹانگ دھرے گنڈیریاں چوس رہی تھی اور ازراہ تفنن چھلکے موسیتاروں کی طرف پھینک رہی تھی ۔

جندوڈا چھڑی ہاتھ میں لے بحری قزاق کو ہدایات دے رہا تھا ۔ اتنے میں ایک بیرا جو بلی کو گود میں لے ہمیشہ دیوار کے ساتھ آ کر کھڑا ہو جاتا تھا آگے بڑھ کر کہنے لگا " کوئی پارٹ وغیرہ مجھے بھی دیں جناب ۔ میں بیکار پڑے پڑے تنگ آ گیا ہوں "

جندوڈا کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی کا دل آسانی سے نہ ٹوٹنے پائے ۔ فوراً اس نے حامی بھر لی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ۔ پروڈکشن انچارج صاحب ۔ اسی وقت ان کا شاندار پارٹ تیار کریں ۔ بلی بھی بیچ میں آ جائے تو کوئی حرج نہیں ۔ ذرا وارئٹی رہے گی ۔

میں نے دل پر جبر کر کے کاغذ قلم منگوایا ۔ چند الٹی سیدھی سطریں لکھیں

اور کاغذ بیرے کو پکڑا دیا۔ وہ یہ کاغذ لے کر سیدھا جندوڈے کے پاس پہنچا اور شاق لہجے میں بولا " آپ کے منشی صاحب نے مجھے ٹرخانے کی کوشش کی ہے۔ بڑا ڈھیلا ڈھالا پارٹ ہے۔ ڈائیلاگ ذرا جذباتی ہونے چاہئیں
جندوڈا نے اچانک ہدایت کار کا رنگ اختیار کر لیا۔ چھڑی گھما کر بولا وہ تو شکر کر کینیڈین بادشاہزادے کہ ہم نے تجھے اس ڈرامے میں شامل کر لیا بلکہ تیری بلی کو بھی چانس دے دیا۔ ورنہ فی زمانہ کون کسی کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا ہے۔ اب اپنی بلی کو لے کر وائی کنگ کے پیچھے کھڑا ہو جا اور اپنا پارٹ یاد کر"

یہ کہہ کر جندوڈے نے اس کی کمر پر ایک چھڑی اس طرح رسید کی کہ بیرے کے ساتھ بلی بھی بلبلا اٹھی۔

کچھ دیر تک میں ریہرسل دیکھتا رہا۔ جب موسیقی کا شور ناقابل برداشت ہو گیا تو ڈسپرین کی گولیاں لینے کے بہانے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر ایک دیوار پر نظر پڑی۔ میرا بنایا ہوا اشتہار ترمیم و اضافے کے بعد اس طرح جگمگا رہا تھا۔

سیلاب زدگان کی امداد کے لئے
" انکھیوں کے جھروکوں سے "
تحریر و ہدایات و پیش کش
جے ڈبلیو

مس روپ کنول اور خوبرو مسٹر جے ڈبلیو کی شاندار جوڑی سنسر کی زد سے اب تک آزاد آج ضرور دیکھیے۔

اس رات جندوڈا ساڑھے بارہ بجے زنجیر کو کنڈے سے الگ کر اندر داخل ہوا اور دبے دبے جوش سے ساتھ کہنے لگا " چین کے شہزادے تین دن بعد ہم گرینڈ ریہرسل کر رہے ہیں جس میں شہر بھر کے اخباری نمائندوں اور نامہ نگاروں کو مدعو کیا جائے گا۔ یہ رہی فہرست "

یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی چوڑی فہرست میرے سامنے رکھ دی اس میں

بڑے بڑے اخباری نمائندوں کے علاوہ مضافاتی رسائل و جرائد کے خود ساختہ مدیروں اور پرنٹروں کے نام بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

" ایک میری طرف سے " جندوڈے نے میرا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ " ان معزز ہستیوں کو دعوت نامہ جانا چاہئے جس کی عبارت تمہارے ذمے ابھی اور اسی وقت فٹافٹ فوراً ہے یہ لو قلم اور یہ رہا کاغذ " جندوڈے نے میری میز سے مطلوبہ چیزیں اٹھا کر میرے حوالے کیں۔

میں نے خط کا ڈرافٹ تیار کیا۔ یہ چیئرمین جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کی جانب سے پریس کے نام کھلا خط تھا۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ کوئی قوم حقیقی معنوں میں اس وقت تک زندہ قوم کہلانے کی مستحق نہیں جب تک کہ وہ فنون لطیفہ کی سرپرستی نہ کرے۔ اور خاص طور پر تاریخی اور معلوماتی ' اخلاقی اور رومانی ڈراموں کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ ساتھ ہی معزز پریس نمائندگان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ تیسرے دن ٹھیک پانچ بجے رائل وکٹری ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں چائے نوش فرمائیں اور ڈرامے کی گرینڈ ریہرسل دیکھ کر اپنے قیمتی خیالات سے بھی آگاہ فرمائیں

اگلے دن یہ عریضہ ایک کاتب کے حوالے کیا گیا جس نے مناسب اصلاح و ترمیم کے بعد اس عریضے کی کتابت کا فریضہ انجام دیا اور حاشیے پر کارکردگی دکھانے کے لے بے شمار آنکھیں بنا دیں۔ جندوڈے کو شبہ گزرا کہ یہ آنکھیں انسانی نہیں الو کی ہیں لیکن وقت اتنا گزر چکا تھا کہ انہی آنکھوں پر اکتفا کرنا پڑا۔

اب جندوڈے نے مجھے ہدایت کی کہ میں تین دن کی چھٹی لے کر اسٹیج کے تمام لوازمات ' پردے ' مائک ' ملبوسات ' روشنیوں اور میک اپ کے سامان کا بندوبست کروں۔ میں نے پڑوسیوں سے مانگ تانگ کر چند

غرارے ' گوٹے کناری والے دوپٹے ' چوڑی دار پائجامے اور چند گلدان حاصل کئے اور صاف الفاظ میں مزید لوازمات کی فراہمی سے معذوری ظاہر کر دی۔

جندوڈا میری آنکھوں میں گھورتا رہا بولا " کوئی بات نہیں چین کے شہزادے ۔ مجھ پر آج وقت پڑا ہے تو سب آنکھیں چرا رہے ہیں انشاء اللہ جب میرا کڑا وقت گزر جائے گا تو سب میرے پاس بھاگے آئیں گے ۔ اس وقت میں ہر فرد و بشر کو ٹھینگا دکھاؤں گا اور کسی کو پرافٹ میں شریک نہیں کروں گا خواہ وہ میرا دوست عظیم دانشور پروفیسر بی کے بٹالہ ہی کیوں نہ ہو " یہ کہتے کہتے وہ گلوگیر ہو گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھا اور کہا " محض ایک ڈرامے کی وجہ سے اس دوستی پر آنچ نہیں آنی چاہیے ۔ ڈرامے تو آدمی سینکڑوں کر لیتا ہے دوستی ہر روز نہیں کر سکتا "

جندوڈے نے نیم دلی سے میرا عذر قبول کیا ۔ کہنے لگا ۔ اتنی جلدی میں پروڈکشن انچارج جیسی نازک پوسٹ پر کس کا تقرر کروں ۔ کم از کم اس ڈرامے کے خاتمے تک اپنے عہدے کی لاج نبھاؤ چین کے شہزادے ۔ ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا "

گرینڈ ریہرسل کے دن جندوڈے کی بدحواسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ کسی بیرے سے مانگی ہوئی اچکن اور سگرٹوں کی پنی سے بنایا ہوا تاج پہن رکھا تھا ۔ گلے میں پلاسٹک کے ہیروں کی مالائیں تھیں ۔ ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا ۔ ایک مونچھ کا سلوشن اکھڑ گیا تھا لہٰذا وہ ٹھوڑی سے نیچے جھول رہی تھی ۔ جندوڈے نے اخباری نمائندوں کا استقبال کرنے کی خوشی میں جھولتی ہوئی وہ مونچھ اکھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لی ۔

ہیروئن انتہائی شوخ میک اپ اور جھجھماتے ہوئے لباس میں اپنی عمر سے بیس برس چھوٹی لگ رہی تھی اور ایک طشتری میں مصری کی ڈلیاں اور الائچیاں مہمانوں کو پیش کر رہی تھی ۔ بحری قزاق اپنی ایک آنکھ پر کھوپا

چڑھائے خوفناک لباس زیب تن کئے ' ٹین کی تلوار لہراتا مہمانوں سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

مست قلندر ہاتھی اور اس کے ساتھی جھومتے جھامتے پان چباتے پچکاریاں چھوڑتے اسٹیج پر آئے ۔ جھک کر تسلیمات عرض کی اور ایک قوالی شروع کر دی ۔ جب الاپ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا تو جندوڈا اسٹیج پر نمودار ہوا اور اس نے جھپٹ کر مائک اپنی طرف کھینچ لیا اور تقریر شروع کر دی ۔ پریس کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور کمر میں اڑسی ہوئی اپنی ٹین کی تلوار نکال کر بار بار لہرانے لگا۔

ہم آرٹ کی خدمت کرنے کے لیے میدان میں آئے ہیں ۔ ہمارے کوئی سیاسی عزائم نہیں ۔ حالاں کہ ہم سیاست اور سیاست دانوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں "۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں تو اسے شہ مل گئی ۔ تلوار لہرا کر اسٹیج پر اچھلا اور کہنے لگا ۔ " جندوڈے کے آگے سیاست کیا چیز ہے ۔ میں تو حکومت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا ۔ کئی بار مجھے وزارتوں کی پیش کش ہو چکی ہے مگر یاد رکھو چین کے شہزادو میں کوئی بکاؤ مال نہیں ۔ یہ گردن کٹ تو سکتی ہے مگر جھک نہیں سکتی ۔ جو میری گردن جھکانے کی کوشش کرے گا میں تلوار سے اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گا ۔ تباہ کر دوں گا ۔ برباد کر دوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے اچھل اچھل کر نادیدہ دشمنوں پر شدید حملے شروع کر دیئے ۔ ان حملوں کے تیور دیکھ کر مست قلندر ہاتھی ایک طبلے کی آڑ میں لیٹ گیا اس کے ساتھی ساز چھوڑ کر بھاگے ۔ ایک سازندہ جندوڈے کی زد میں آگیا ۔ وہ اس کھسیائے ہوئے سازندے پر تلوار سونت کر پل پڑا ۔ گرج کر بولا ۔ " بھاگتا کہاں ہے ۔ سامراجی گماشتے ۔۔ کرائے کے ٹٹو ۔۔ بجر بٹو ۔۔ نکال اپنے حمائتیوں کو ۔۔ آج سب سے نمٹ لوں گا۔ "

پریس نمائندگان نے اسے ڈرامے کا ٹریلر سمجھ کر خوب تالیاں بجائیں ۔ اتنے میں ہیروئن اٹھکیلیاں کرتی ' مٹک مٹک کر چلتی جندوڈے کے پاس

آکر کھڑی ہو گئی اور اسے محبت آمیز نظروں سے گھورنے لگی۔
جندوڈا اس کی آمد پر بے حد خوش ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ جھاڑیوں سے برآمد ہونے والا سین دکھانا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ فوراً ہی چند ملازمیں گھاس پھونس کے ڈھیر لے کر حاضر ہو
۔ فوری طور پر جنگل بنایا گیا۔ جندوڈے نے مست قلندر ہاتھی کے ٹینٹوے میں تلوار کی نوک چبھو کر کہا۔ " میوزک ڈائریکٹر صاحب۔ عاشقانہ میوزک چالو کریں۔
بھاگے ہوئے سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے لئے۔ سین شروع ہوا ۔ ایک جھاڑی کی اوٹ سے جندوڈا نمودار ہوا۔ دوسری جھاڑی کی اوٹ سے سفید مونچھوں والا۔ ابھی ہم کچھ سمجھ نہیں پائے تھے کہ سفید مونچھوں والے نے لپک کر مائک پر قبضہ جما لیا اور چیخ کر بولا " میں کئی دن سے اس موقع کی تاڑ میں تھا۔ شکر ہے آج کامیابی سے آپ کے سامنے پہنچ گیا ہوں اب آپ میری عرض سنیں "
جندوڈے نے چاہا کہ لپک کر اس کی گردن ناپ لے لیکن وہ متوقع خطرات بھانپ چکا تھا۔ ایک دم اسٹیج سے مائیکروفون سمیت صحافیوں کی بھیڑ میں کود گیا۔ جندوڈے نے اس کا تعاقب کیا لیکن سفید مونچھوں والے نے ایک معمر صحافی کی آڑ لے لی اور بلند حقیقت جاگئے بیان کرنی شروع کر دی

متجسس صحافی اس کر گرد جمع ہو ۔
" کیا ہوا ۔۔ کیا ہوا ۔۔۔ معاملہ کیا ہے ۔۔" ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔
معاملہ یہ ہے جناب " سفید مونچھوں والا ہانپتے ہوئے بولا " میری بیوی اغوا کر لی گئی ہے "
جندوڈا نے چاہا کہ تلوار کا ایک ہاتھ اس کی کھوپڑی پر رسید کرے لیکن صحافی آڑے آ ۔ کہنے لگے " ذرا صبر تحمل سے کام لیں چیئرمین صاحب فریق ثانی کی بات بھی سننے دیں

جندوڈا بے بسی سے گردن جھٹک کر بولا " لیکن چین کے شہزادو آپ لوگوں کو میں نے مدعو کیا ہے ۔ آپ میرے مہمان ہیں ۔ یہ بن بلایا مہمان بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا ؟

سفید مونچھوں والا بگڑ کر بولا ۔ " صیغہ واحد استعمال نہ کریں ۔ جمع کا صیغہ استعمال کریں ۔ کیوں کہ میں اکیلا نہیں آیا ہوں ۔ محلے داروں کو ساتھ لایا ہوں ۔ سب باہر کھڑے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں ۔ ذرا باہر تو نکلیں ۔

صورت حال انتہائی نازک رخ اختیار کرنے والی تھی ۔ کسی بھی وقت پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دے سکتے تھے ۔

میں نے جندوڈے کی نظر بچا کر باہر نکلنا چاہا لیکن وہ مجھے دیکھ چکا تھا ۔ چیخ کر بولا " چین کے شہزادے میرے عظیم دوست ۔ عظیم دانشور ۔ پروفیسر بی کے بٹا اس نازک موقع پر مجھے تنہا چھوڑ کر تم حسب عادت کہاں غائب ہو رہے ہو ؟

میں نے کہا تمھاری مناسب امداد کی تلاش میں نکل رہا ہوں "

جندوڈا زور سے بولا " مجھے تمھاری امداد کی نہیں تمھاری موجودگی کی ضرورت ہے ۔ خدا کے لیے کھسکنے کی کوشش نہ کرو

مگر اس سے پہلے کہ صحافی مجھے غور سے دیکھتے اور میرا چہرہ ان کی نظروں میں آتا میں نے بڑی پھرتی دکھائی اور ایک میز کے نیچے سے غوطہ لگا کر دوسری طرف سے باہر نکل آیا ۔ جب میں نے دروازے سے باہر نکلنے کے لیے دایاں پاؤں آگے بڑھایا کہ اچانک میرے سامنے بلی والا بیرہ آگیا بلی حسب معمول اس کے کاندھے پر سوار تھی اور وہ کینہ توز نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا ۔ کہنے لگا ۔

" مجھے معلوم ہے کہ تم دم دبا کر بھاگ رہے ہو ۔ تم وہی کنجوس منشی ہو نا جس نے میرے لیے بڑی مشکلوں سے چار سطریں لکھی تھیں ۔ تب تمھارے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے ۔ آج تمھیں اپنی جان کے لالے

پڑے ہوئے ہیں -- ہاہا --- اسے کہتے ہیں قدرت کا انتقام "
میں نے اسے دھکیل کر پرے نکل جانا چاہا مگر اس نے مدافعت میں اپنی بلی کو ڈھال کر طرح سامنے کر دیا۔ بلی نے دانت نکوس کر مجھے دیکھا۔ تھوڑا سا خرخرائی۔ میں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک مکہ بیرے کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ وہ چکرا کر گرا اور گرتے گرتے اس نے بلی مجھ پر اچھال دی -- یہ جو میرے چہرے پر چند خراشوں کے نشان نظر آتے ہیں اسی واقعے کی یادگار ہیں۔ جب جے ڈبلیو آرٹ پروموٹرز کے پروڈکشن انچارج پروفیسر بی کے بٹالہ سے ایک بیرے نے بلی کے ذریعے انتقام لیا۔ اگرچہ میں اس خوفناک مہم سے واپسی پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں لیکن اپنے کرمفرماؤں کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بلی اگر بھوکی ہو اور اپنے مالک کے کندھوں پر سوار ہو تو ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

ظالم ہیں لوگ ادھر کے....

ہمارے محلے میں مچھر نہیں ہیں۔ جب سے استاد الفت خان برچھی نے پڑوس میں کرائے پر مکان لیا ہے، قوالیاں گا گا کر اور تالیاں بجا بجا کر آپ نے اور آپ کے شاگردوں نے مچھروں کو اتنا خوفزدہ کر دیا ہے کہ اب مچھر کیا محلے کے لوگ بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے شروع شروع میں جب آپ نے یہاں مکان لیا تھا تو پہلے روز محلے کی اصلاح معاشرہ کمیٹی کے چیئرمین آپ کے پاس گئے تھے اور عرض کی تھی کہ کل ساری رات استاد محترم مشق ستم فرماتے رہے جس کی وجہ سے اہالیان محلہ کو نیند نہ آسکی۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ استاد اس وقت نئی قوالی کی تیاریوں میں تھے۔ دھن اور لے تیار ہو رہی تھی۔ طبلے اور ہارمونیم کے پردے سے جا رہے تھے۔ کڑک کر فرمایا۔ "کیوں میاں، آپ مالک مکان ہیں؟"

چیئرمین حواس باختہ ہو گیا۔ ایس کڑک دار آوازیں اس نے کم ہی سنی تھیں۔ گھگھیا کر بولا۔ "جج جی نہیں"۔ استاد نے اطمینان سے کہا۔ "تو پھر تشریف لے جائیے اور مالک مکان کو بھیجیے" لوگوں نے مالک مکان کو جا گھیرا۔ وہ چھ ماہ کا اچھا خاصا ایڈوانس لے بیٹھا تھا لہٰذا استاد کی حمایت پر تل گیا۔ کہنے لگا "حضرات! ایک شخص اللہ رسول کا نام لیتا ہے آپ کو چھیڑتا نہیں۔ تنگ نہیں کرتا۔ خدانخواستہ کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ چھ ماہ کی رقم کرایہ پیشگی دے چکا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ناحق اسے گھر سے بے گھر کر دوں"۔

لوگوں نے خاصی دلیلیں دیں۔ خاصی بحثیں کیں۔ خاصی تو تکار ہوئی لیکن مالک مکان آپ کے حق میں سینہ سپر ہو گیا۔ لیجیے صاحب دیکھتے ہی دیکھتے استاد کے قدم محلے میں جم گئے۔ قدم کیا بلکہ آپ سینوں پر مونگ دلنے لگے۔ وہ دن آج کا دن مچھروں نے ہمارے محلے کا رخ نہیں کیا۔

پاس پڑوس کے ڈاکٹر ملیریا کے دنوں میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں ۔ استاد قریب سے گزریں تو انھیں کینہ توز نظروں سے گھورتے ہیں اور بعد میں ببانگ دہل کہتے ہیں کہ یہ شخص اعصابی امراض کا موجد ہے محلے میں ایک ماہر نفسیات کا کلینک بھی ہونا چاہیے تاکہ اس کے ستم رسیدہ مریض وہاں رجوع کر سکیں ۔

استاد اب تک کئی محلے ' بیویاں اور شاگرد بدل چکے ہیں ۔ بوٹا سا قد پایا ہے ۔ رنگ سانولا ہے ۔ چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ ہیں ۔ بال ساٹن کے لٹھے کی طرح قطع و برید کے بغیر پورے چہرے پر سرسراتے اور کنڈیاں مارتے رہتے ہیں ۔ جوش کے عالم میں آپ اپنے بالوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو رقاصہ رقص کے عروج پر اپنی گھیردار فراک کے ساتھ کرتی ہے ۔ زیادہ غیض و غضب میں آجائیں تو بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں پکڑ کر بل دینے لگتے ہیں ۔ دوسری منہ میں بانسری کی طرح لے لیتے ہیں ۔ عجیب و غریب طرز ادا ہے ۔ مثلاً شعر ہے ۔

کسی کو دیکھ کے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

پہلا مصرعہ آپ اتنے سپاٹ انداز میں پڑھ جائیں گے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی ۔ پھر یکایک کچکچا کر اس مصرعے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گے ۔ عین مائیکروفون میں منہ ڈال کر چنگھاڑیں گے " ۔ کسی کو " پھر ایک لمبا وقفہ ڈال دیں گے ۔ گھور گھور کے سامعین کو دیکھیں گے ۔ " کسی کو دیکھ کے " ذرا دم لیں گے ۔ ادھر ادھر دیکھیں گے ۔ ایک دم پورا مصرعہ پگلے ہوئے سیسے کی طرح کانوں میں انڈیل دیں گے " کسی کو دیکھ کے ساقی ایسے ہوش اڑے " " دو مرتبہ دھاڑتی آواز میں یہی مصرعہ دہرائیں گے ۔ پھر دم سادھ لیں گے ۔ چند لمحوں بعد تاسف انگیز آواز میں کہیں گے ۔ " اللہ معافی " ساتھ ہی کانوں کو ہاتھ لگائیں گے ۔ فوراً ایک شعر پڑھیں گے ۔

ظالم ہیں لوگ ادھر کے ' زمانہ خراب ہے
باہر نہ جا سنور کے ' زمانہ خراب ہے

پھر فوراً دوسرا مصرعہ پڑھ کے اس طرح وضاحت کریں گے " شراب سیخ پہ -- ہیں جی - کیا سمجھے صاحب شراب سیخ پہ -- کباب شیشے میں -- حد ہو گئی - قسم خدا کی حد ہو گی - میں کہتا ہوں اللہ معافی - زمانہ خراب ہے - تباہیاں ہیں - بربادیاں ہیں - حد ہو گئی حد ہو گئی - شراب سیخ پہ ؟ آئی بات عقل شریف میں ؟ --- کباب شیشے میں ؟ کمال ہو گیا - اب یہ حشر ہونا تھا - توبہ توبہ - میری توبہ - یا رب میری توبہ - میری توبہ توبہ "

اکثر فرماتے ہیں - " میرا اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا ایک ہی مشغلہ ہے - ایسے شاعر تلاش کرنا جن کی شاعری بس ڈرائیور کلینر اور چھابڑی فروش فوراً سمجھ جائیں - دماغ سوزی نہ کرنی پڑے - یہی وجہ ہے کہ عوام ہمیں پسند کرتے ہیں کیونکہ ہم فلسفہ نہیں جھاڑتے ان کو ان کے مطلب کی چیز نکال کے پیش کرتے ہیں " - ایک دن کہنے لگے " آپ بھی شاعری کرتے ہیں - ہمارے کئے بھی ایک قوالی تیار کر دیجئے - جو ویلیں ملیں گی اس میں سے آدھی آپ کی - "

ہم نے کہا " پیش کش کا شکریہ - لیکن آپ کی پسندیدہ چیز ہم سے تیار نہیں ہو سکے گی استاد - " چمک کر بولے " وہ کیوں برخوردار ؟ "

ہم نے کہا " اس کے لیے چھیالیس انچ چوڑی چھاتی اور بڑے گھڑے کے سائز کا گلا چاہئے جو سردست ہمارے پاس نہیں ہے - یہ کوچہ قوالی آپ کو مبارک - ہمیں اسی گوشہ نشینی میں جینے دیجئے - جہاں ملیریا کے موسم میں بھی مچھر نہیں پھٹکتے - ہر مچھر یہ شعر پڑھ کر سٹک جاتا ہے --

ظالم ہیں لوگ ادھر کر ' زمانہ خراب ہے
باہر نہ جا سنور کے ' زمانہ خراب ہے

تھاں مار دیاں گا!

ہمیں اپنی فلم انڈسٹری کی مستقل مزاجی پر رشک آتا ہے۔ چالیس بیالیس سال سے وہی ٹیکنیشن ہیں، وہی ترکیبیں ہیں وہی فارمولے ہیں۔ وہی ڈانگ سوٹے ہیں۔ وہی بڑکیں ہیں اور وہی ڈزا ڈز تے کھچا کھچ ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی، مگر ہمارے فلمی منشی صاحبان اب تک اس غور و فکر سے باہر نہیں نکلے کہ سچویشن میں گیت کی گنجائش کیسے نکالی جائے۔ کل ہی کی بات ہے کہنے لگے کہ مجید گل بکاؤلی صاحب بڑے پریشان، آشفتہ و دیگر ہمارے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔" بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟

ہم نے پوچھا۔" مسئلہ کیا ہے؟

بولے" ہیرو جیل سے چھوٹ کر ماں سے ملنے گھر آرہا ہے۔ ماں نے گھر میں مجرے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اب پریشانی یہ ہے کہ ہیرو کی انٹری کیسے ڈالی جائے۔

ہم نے کہا" ویسے ہی ڈال دیجئے جیسے آج تک ڈالتے آئے ہیں"

بولے" نہیں، اس طرح بات نہیں بنتی۔ ہر فلم میں تھوڑا بہت فرق رکھنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً پچھلی فلم میں ہم نے ہیرو کو گھوڑے سے درخت پر اور درخت سے اپنے گھر میں چھلانگ مارتے دکھایا تھا۔ عین اس وقت اس کی انٹری ڈالی تھی، جب اس کی بہن کی ڈولی رخصت ہو رہی تھی۔ اب سچویشن اتنی ڈرامائی نہیں، ہیرو قتل کے الزام سے باعزت بری ہو کر اپنے حواریوں کے ساتھ چار کھلی جیپوں میں گھر آرہا ہے، جہاں اس کے استقبال کے لئے مجرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

ہم نے کہا" اب آپ گھنگروؤں سے سین اوپن کریں، جو رقاصاؤں نے پہن رکھے ہیں۔ ہیرو کی مسلسل فائرنگ سے ایک ایک گھنگھرو ٹوٹتا جاتا ہے۔ اور فریم میں ہیرو کا وزنی پاؤں داخل ہوتا ہے جو عین طبلے پر پڑتا ہے۔ اوئے بند کرو یہ کھپ خانہ۔ تھان مار دیاں گا۔"

یہ سنتے ہی مجید گل بکاؤلی فرط مسرت سے اچھل پڑے۔ ناچ اٹھے۔ کہنے لگے " " اسے کہتے ہیں خداداد صلاحیت۔ کیا انٹری ڈالی ہے۔ آپ فلمی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے۔"

ہم نے۔ " گل بکاؤلی صاحب۔ اگر ہم فلمی کہانیاں لکھنے لگے تو آپ کا کیا بنے گا۔ یہی سوچ کر ہم اس شعبے کا رخ نہیں کرتے کہ کسی کی روزی پر لات مارنا اچھی بات نہیں"

بولے " یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کیا' آپ کیا' احمد ندیم قاسمی بھی ہماری روزی پر لات نہیں مار سکتے کیونکہ سیریز تو ہم نے لکھنا ہوتا ہے' کہانی میں حسب خواہش ردو بدل تو ہم کرتے ہیں' کوئی مائی کا لال اس شعبے میں ہمارے لیے مشکلات کھڑی نہیں کر سکتا"۔

ہم نے پوچھا۔ " غالباً اس لیے کہ کاسٹ اور کہانی ہر جگہ تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ صرف لباس اور گٹ اپ بدلنا پڑتا ہے"۔

بولے " اس کی ضرورت نہیں پڑتی' اس وقت شہر کے جتنے سینما گھر ہیں' ان کہ ایک چکر لگا کر فلموں کے پوسٹر دیکھ لیجئے۔ صاف پتہ چل جائے گا کہ ایک ہی ہیرو کی مونچھیں درجن بھر فلموں کی کفالت کر رہی ہیں۔ اسے اتنی فرصت کہاں کہ مونچھوں کا سائز تبدیل کرے' البتہ وہ لاچے کرتے اور چادر وغیرہ میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لیتا ہے"۔

" حالانکہ اسے اداکاری میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں" ہم نے کہا۔

" یہی کام مشکل ہے" مجید گل بکاؤلی نے کہا" ہمارے ہیرو کے پاس ان فضول باتوں پر سوچ بچار کے لیے وقت نہیں۔"

" کیا ہمارے اداکار اسکرپٹ پڑھتے نہیں۔ کہانی سنتے نہیں؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آئے کہ وہ اسکرپٹ کی باریکیوں پر غور کرے' یہ کام مصنف ہدایت کار اور کیمرہ مین کا ہے۔ ہیرو پہنچ جاتا ہے۔ ابھی ساتھ والے فلور پر وہ جس اداکارہ کو بہن کہہ کر اس کے سر پر اوڑھنی رکھ رہا تھا اسی کے ساتھ دوسرے فلور پر اسے

بادلوں کی چمک بجلی کی کڑک اور موسلا دھار بارش کے دوران اظہار محبت کرنا ہے۔ تیسرے فلور پر اسے ماں کی لاش کاندھے پر اٹھا کر ہجوم کے سامنے قاتلوں سے نمٹنے کا عہد کرنا ہے چوتھے فلور پر اسے پولیس مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے بعد آؤٹ ڈور شوٹنگ ہے جس میں وہ ہیروئن ہاتھی ہوئی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ہم نے کہا۔ "کیا پوری انڈسٹری میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں۔ جو تشدد' جرائم قتل' ڈاکے" خون' گولی اور بندوق سے ہٹ کر بھی کچھ سوچے۔

"ہیں کیوں نہیں۔۔ "گل بکاؤلی نے کہا" بے شمار ہیں۔۔ لیکن"

ہم نے جلدی سے پوچھا" لیکن کیا؟"

وہ ہنس کر بولے "لیکن نہ وہ فلمیں لکھتے ہیں' نہ بناتے ہیں' آپ کی طرح گھر میں بیٹھے سوچتے رہتے ہیں کہ ہماری فلموں کا معیار بلند ہونا چاہیے' ان کے موضوعات میں تبدیلی آنی چاہیے' یہ ہونا چاہیے' وہ ہونا چاہیے' لیکن ہوتا وہی ہے جو ہم چاہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ لہراتے ہوئے اٹھے' اپنے منہ میں الٹا ہاتھ رکھ کر زوردار الفاظ میں بابا کا نعرہ لگایا اور گرج دار آواز میں کہا" اوئے چپ کر جا ٹیبل ٹاکرا۔۔ ورنہ تھاں ماردیاں گا۔۔ خدا حافظ۔۔۔"

یہ کہہ کر دروازے کو ایک ٹھوکر رسید کی اور یہ جا وہ جا۔۔

اصلی اور نقلی شیر

پنجاب کو اس لیے بھی شہرت حاصل ہے کہ میدانی علاقہ ہونے کے باوجود یہاں شیر بہت پائے جاتے ہیں۔ ہر چھٹے ساتویں مہینے ایک نہ ایک شیر کی دھاڑ سنائی دیتی ہے۔ عقیدت مند اسے شیر پنجاب کا خطاب دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سرکس بہت مقبول ہے۔ ہم نے جب لکی

ایرانی سرکس کا نام سنا تو بہت خوش ہوئے۔ جا کر سرکس کے اسٹاف سے ملے جو تین مسخروں، دو بوڑھیوں، پانچ پہلوانوں، دس بلیوں، چار گھوڑوں اور ایک ہاتھی نما چیز پر مشتمل تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس چیز کو ہم نے ہاتھی کا درجہ دیا ہے وہ اس سرکس کے پروپرائیٹر ہیں۔ پرانے پہلوان رہ چکے ہیں لہٰذا کوشش کرتے ہیں کہ مخاطب سے مصافحے کی بجائے معانقہ کریں اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے دم لیں۔

ہم نے معانقے کے بعد خاصی دیر تک سکوت اختیار کیا اور اس عرصے میں ٹٹول ٹٹول کر اپنی پسلیاں گنتے رہے۔ جب اوسان بحال ہوئے تو عرض کی "سرکس میں کام کرنے والے فنکاروں سے ملوائیے۔ ہم ان کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں"

پروپرائیٹر صاحب نے فرمایا "بڑے شوق سے بادشاہو۔ سب سے پہلے آپ ہمارے شیر سے ملیں۔ اپنا ہی بندہ ہے"۔ یہ کہہ کر وہ ہمیں نیم تاریک قنات کے اس کونے میں لے گئے جہاں ایک سوکھا سڑا مریل سا کبڑا آدمی اوندھا لیٹا ہوا تھا اور ایک تگڑا سا ماشیاء اس کی مالش کر رہا تھا۔

"اٹھ اوئے بدبختا" پروپرائیٹر نے گرج کر کہا"۔ دیکھتا نہیں رپورٹر صاحب آئے ہیں۔ جا اوئے ڈبل دودھ پتی کی چاء لے آ"

وہ ننھا سا آدمی اپنی لنگوٹی سنبھال کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چائے لینے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو چائے کی میلی کچیلی ٹرے اور کنڈوں کے بغیر پیالیاں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ نیلی نیلی رگوں سے بھری ہوئی کہنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جب چائے اس نے ہم دونوں کی طرف بڑھائی تو پروپرائیٹر نے تعارف کروایا۔ "ان سے ملئے جناب، یہ ہیں ہمارے سرکس کے شیر"

ہم نے حیرت سے اس نحیف و ناتواں شخص کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ ہے شیر؟"

پروپرائیٹر نے سر ہلا کر کہا "جب اسے شیر کی کھال پہنا دیتے ہیں تو یہ شیر

بن جاتا ہے۔ کھال اتار دیتے ہیں تو اندر سے وہی اللہ دتہ برآمد ہو جاتا ہے آپ کو کوئی اعتراض؟

ہم نے کہا "ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ احتیاطاً اصلی شیروں سے پتہ کر لیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اس دھاندلی کا برا منایا ہو۔"

اللہ دتہ عرف شیر سرکس نے اپنے کب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جناب عالی! شیر کی کھال پہن کر چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے چلتے میرا کب نکل آیا ہے اور آپ ہیں کہ اب تک اصلی نقلی کی بحث میں پڑے ہوئے ہیں۔ ذرا ایک مرتبہ میری طرح شیر کی کھال پہن کر رنگ میں جا کر دکھائیں۔ عقل ٹھکانے آ جائے گی"۔

ہم نے غور کیا تو واقعی اللہ دتے کے ایثار، قربانی، محنت اور مشقت کے قائل ہو گئے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے انسان کو کیسے کیسے سوانگ رچانے پڑتے ہیں اللہ دتہ اس لحاظ سے بھی قابل داد نظر آیا کہ وہ لوگوں کو شیر کا خوف دلانے کے لیے کم سے کم شیر کی کھال تو پہن لیتا ہے۔ ہمارے بعض شیر تو یہ بھی نہیں کرتے۔ اس تکلف میں پڑ کر وقت ضائع نہیں کرتے۔ سیدھے رنگ میں پہنچتے ہی اعلان کر دیتے ہیں کہ شیر آ گیا ہے۔ لوگ پتلون شرٹ اور شلوار قمیض والے شیروں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب چڑیا گھر میں جا کر اصلی شیر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اصلی شیروں پر سے ان کا ایمان اٹھ چکا ہے۔

ہم نے پروپرائیٹر صاحب سے کہا "آخر آپ اصلی شیر کیوں نہیں خرید لیتے"۔

انہوں نے مونچھوں پر بل دے کر کہا میری سرکار ہمیں اصلی نقلی کے چکر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو کام چلانا ہے، روٹی کمانی ہے، سرکس دکھانا ہے۔ یہ سوال تو آپ جا کر ان سے پوچھیں جو کھال کے بغیر شیر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور لطف یہ کہ لوگ انہیں تسلیم بھی کر لیتے ہیں

اس دلیل نے ہمیں قائل کر لیا۔ ایک زمانہ تھا کہ شیر کہلانے کے لیے شیرانہ صفات کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً تحمل، بردباری، ٹھہراؤ، برداشت، بہادری، کشادہ دلی، اعلیٰ ظرفی وغیرہ وغیرہ۔ دیسی گھی اور بعض دواؤں کے ڈبوں پر دھاڑتے چنگھاڑتے شیر کی تصویر پیلے اور سرخ رنگ میں چھپتی تھی۔ اسے دیکھ کر کمزور دل اصحاب کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ وہ اپنی بند گھگھی کھولنے کے لیے شیر مارکہ گھی استعمال کرتے تھے۔ اور شیر برانڈ دوائیں پیتے تھے۔ چند دنوں بعد نہ صرف ان کی گھگھی کھل جاتی تھی بلکہ وہ شیروں کی طرح دھاڑنے اور چنگھاڑنے اور للکارنے لگتے تھے۔ بعض فلم انڈسٹری میں مقبول ہو جاتے بعض سیاست میں چلے جاتے۔ جو باقی بچتے وہ سرکس کمپنیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ اکا دکا شیر صحافت کے میدان میں بھی چھلانگ مارتا نظر آتا۔

بہرحال اس دور میں جب کہ پوری دنیا سے رفتہ رفتہ شیروں کا وجود مفقود ہوتا جا رہا ہے پنجاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ابھی تک اس کے میدانوں میں شیر دندناتے پھرتے ہیں۔ دنیا کے جس ملک میں یہ چوپایہ نابود ہو چکا ہو۔ وہ ہم سے منگوا لے۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ ایک درجن شیروں کا یکمشت آرڈر دینے پر ایک اصلی شیر کی کھال مفت ارسال کی جائے گی اور اسے اوڑھنے کے لیے ایک عدد اللہ دتہ بھی روانہ کیا جائے گا۔

ڈزاڈز تے کھچا کھچ

حال ہی میں ہم نے ایک پنجابی فلم دیکھی ہے اور سینما ہال سے باہر نکل کر اب تک سوچ رہے ہیں کہ اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست دیں۔

بخدمت جناب عالی ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دام ظلکم

جناب عالی نہایت ادب سے گزارش ہے کی ہم انتہائی شریف اور پرامن شہری ہیں اور ہماری استدعا یہ ہے کہ براہ کرم ہمیں چند کلاشنکوفیں، جیپیں ار اسلحہ و بارود کا وافر ذخیرہ عنایت فرمایا جائے، تاکہ ہم اپنے دشمنوں سے خود نبٹ سکیں اور قانون کو زحمت نہ کرنی پڑے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کلاشنکوفوں، بندوقوں اور گولہ بارود کا استعمال صرف انہی مقامات پر کریں گے جو فلموں میں دکھائے جا رہے ہیں۔ امید ہے آپ ہماری درخواست پر مناسب احکامات صادر فرمائیں گے۔

العارض

پرامن اور شریف شہری

اس درخواست کا خیال ہمیں فلم دیکھ کر آیا ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ جب ہمارا ہیرو لکشمی چوک سے لوہاری گیٹ تک اور بھاٹی گیٹ سے چوبرجی تک ہزاروں افراد کی موجودگی رواں دواں ٹریفک کے ہجوم میں کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے۔ تو ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہمیں اس آزادی سے محروم رکھا جائے؟ ہم صرف انہی مراعات کے طالب ہیں جو ہم نے فلم میں دیکھی ہیں۔ مثلاً چند کلاشنکوفیں، چند جیپیں، اسلحہ بارود کا ڈھیر اور دزا ڈز تے کھچا کھچ۔ اس سے زیادہ کے ہم طالب نہیں اور اسراف بیجا کے ہم قائل نہیں

ہمارا وعدہ ہے کہ اگر ہمیں مطلوبہ سامان مہیا کر دیا گیا تو ہم اس کا استعمال چھپ کر نہیں کریں گے۔ دن دیہاڑے پبلک مقامات پر سارا اسلحہ و بارود خرچ کریں گے اور اسی طرح بڑکیں مار کر کلہاڑیاں اور کلاشنکوفیں چلائیں گے، جس طرح اس فلم کے ہیرو نے چلائی ہیں۔

ہم نے جب اس خواہش کا اظہار اپنے دانشور دوست تمیز الدین اخلاق سے کیا تو وہ مربیانہ انداز میں مسکرائے۔ بولے "آپ کی خواہش کچھ اتنی غلط بھی نہیں۔ مار دھاڑ والی ہر فلم دیکھ کر تماشائی کا یہی جی چاہتا ہے۔ لیکن ایک بات وہ فراموش کر دیتا ہے۔"

ہم نے پوچھا "کون سی بات"
بولے "معاوضے کی بات۔ فلم میں ہیرو اس اس کام کے لاکھوں روپے لیتا ہے۔"
ہم نے کہا "ہمیں نہیں چاہیں لاکھوں روپے۔ ہم مفت یہ کام کرنے کو تیار ہیں۔"
کہنے لگے۔ "فلموں میں تو یہ سب کچھ اسکرپٹ کے تحت ہوتا ہے۔ کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ کے پاس یہ سب کچھ کرنے کا کیا جواز ہے؟" ہم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "فلم کے رائٹر اور پروڈیوسر کے پاس یہ سب کچھ کروانے کا کیا جواز ہے۔ انہیں کھلی چھٹی کس نے دی۔
بولے عوام نے
ہم نے پوچھا "عوام کا اس میں کیا قصور ہے۔ کیا وہ جلوس نکال کے فلمی اسٹوڈیوز کا گھیراؤ کرتے ہیں کہ للہ مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بناؤ ورنہ ہم ہڑتال کر دیں گے یہیں اسٹوڈیوز کے سامنے دھرنا دے کے بیٹھ جائیں گے ہڑتال کیمپ لگا لیں گے۔"
تمیز الدین اخلاق صاحب نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا "ٹھیک ہے وہ ایسا مطالبہ نہیں کرتے۔ چلو مان لیا۔ لیکن ہم نے یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ عوام کا ہجوم اس قسم کی فلموں کے خلاف جلوس کی شکل میں اسٹوڈیوز پہنچا ہو"
ہم نے کہا "عوام شریف ہیں۔ وہ تو اپنے بنیادی حقوق کے لیے سڑک پر آنا پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ شرفاء کو یہ زیب نہیں دیتا پھر پر تشدد فلموں کے خلاف وہ سڑکوں پر کیوں آنے لگے۔
تمیز صاحب نے کہا "یہی وجہ ہے کہ فلم انڈسٹری قائم ہے۔ ایک گنڈاسے مین سے ڈیڑھ درجن گنڈاسے برآمد ہو رہے ہیں۔ ایک مولا جٹ کے نتیجے میں ایک سو مولا جٹ پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ اکیلے کیا کر

سکتے ہیں ۔ جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو " " ہم نے کہا " مگر محترم دانشور صاحب ۔ اس صورت حال کا کوئی حل بھی تو ہونا چاہیے ۔
تمیزالدین اخلاق صاحب نے لفافوں کے بنڈل میں سے ایک لفافہ نکال کر ہماری طرف بڑھایا ۔ بولے " ایک اخبار کی طرف سے تشدد کے رجحان کے خلاف ایک محفل مذاکرہ منعقد ہو رہی ہے ۔ آپ ضرور آیئے گا ۔ شرکاء کے نام دیکھ لیں ۔ "
ہم نے لفافہ کھول کر دعوت نامہ دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر لفافہ میز پر رکھ دیا ۔ مذاکرے کے شرکاء میں تمام نام وہی تھے جو تشدد جرائم اور ڈزا ڈز کے رجحان کو فروغ دینے والی فلمیں بناتے ہیں ' یا ان میں کام کرتے ہیں ۔

اوور کوٹ کا قضیہ

حضرت اژدر لکھنوی کو شاعری کی چاٹ اوائل شباب میں لگی عموماً یہی وہ دور ہوتا ہے جب غیر شاعر حضرات بھی شاعری کرنے لگتے ہیں ۔ اور شاعر کہلوا کے دم لیتے ہیں ۔ کچھ لوگوں کو عمر کے ایک حصے میں احساس ہوتا ہے کہ شاعری فضول کام ہے ۔ چنانچہ وہ دوسرے مفید کام کرنے لگتے ہیں مثلاً ٹھیکیداری وغیرہ
پل بنا ' چاہ بنا ' مسجد و تالاب بنا
زندگی بھر وہ ایک پل پل ' ایک ہی سڑک اور ایک ہی عمارت بناتے گراتے اور بنک بیلنس بڑھاتے رہتے ہیں ۔ بعد میں حج پر چلے جاتے ہیں اور واپس آکر مکان کی پیشانی پر " آشیانہ حاجی کرم دین ۔ ہذا من فضل ربی " وغیر لکھوا دیتے ہیں ۔ مگر جو صاحبان آشیانہ کرم دین نہیں بنوا پاتے وہ ایک ہی جیسی غزلیں زندگی بھر لکھتے ' کاٹتے ' چھاپتے ' چھپواتے اور اپنی دنیا و عافیت خراب کرتے رہتے ہیں ۔ اژدر لکھونی کا شمار بھی انہی اشعار

پیشہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ لکھنوی سے آپ کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ محض شوقیہ طور پر تخلص کیساتھ لکھنوی جوڑ دیتے ہیں تاکہ اہل زبان سمجھ کر لوگ ان کی شاعرانہ کوتاہیوں کو سند سمجھیں۔ اوائل شباب میں ایک سپیرے کی ناگن صفت بیٹی پر ملتفت ہوئے۔ ایسی غزلیں کہیں جن میں ناگ، ناگن، زہر، تریاق، جانگنی، بین اور من ڈولے میرا تن ڈولے والی فضا بطور خاص پیدا کی گئی تھی۔ یہ غزلیں سپیروں مین بہت مقبول ہوئیں اور جہان سے سانپ نکالنا مقصود ہوتا وہاں بین پر یہی غزلیں بجائی جاتیں۔ سپیروں کا بیان تھا کہ سانپوں میں بھی یہ غزلیں خاصی مقبول ہوئیں کونکہ سانپ سن نہیں سکتے اللہ نے انھیں (سانپوں کو) قوت سماعت عطا کی ہوتی تو سب سے پہلے اژدر صاحب کی شاعری میں زبان و بیان کی غلطیاں نکالتے۔ اور انھیں کاٹنے دوڑتے۔ یہ ایک لحاظ سے اژدر صاحب اور کئی شاعروں کے حق میں اچھا ہوا۔ جان بچ گئی۔

اژدر صاب کو شاعری، عشق اور سپیروں سے دوستی وغیرہ کے علاوہ ایک اور شعبے میں قدم رکھنے کا شوق تھا۔ یہ صنعت کشتہ سازی تھی اور خاصی احتیاط، سوجھ بوجھ اور سرمائے کی متقاضی تھی۔ یہاں انہی چیزوں کا فقدان تھا باقی ہر چیز موجود تھی مثلاً جذبہ، شوق، ہوس وغیرہ۔ شروع شروع میں چند کشتے بنائے۔ مسلسل دھواں دیکھ کر اور دن رات ہاون دستے کی دھما دھم سن کر لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ اس سے قبل کہ تھانہ کچہری کی نوبت آتی آپ نے فن کشتہ سازی سے توبہ کر اس توبہ کے بعد آپ گیسوئے اردو کو نوچنے کھسوٹنے اور تراشنے میں لگ گئے۔ کیونکہ گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ تھی۔ کئی مشاعروں میں بن بلائے پہنچنے اور بڑی آؤ بھگت کے ساتھ سب سے پہلے پڑھوائے گئے اور سب سے پہلے رخصت کیے گئے۔ بعض منتظمین مشاعرہ سے کشید خاطر تھے۔ اب تک بدستور ناراض ہیں اس کے باوجود جہاں کہیں مشاعرے کے انعقاد کی خبر سن لیتے ہیں اوور کوٹ پہنے، کراہتے، بل کھاتے، جوڑوں

کی ہڈیاں چٹخاتے " آداب ' قبلہ ' آداب " کہتے ہوئے جا نازل ہوتے ہیں ۔

حضرت خلال اکبر آبادی کو بھرے مشاعرے میں خوفزدہ کر کے آپ نے جس طرح بھاگنے پر مجبور کیا وہ اردو کی رزمیہ شاعری میں درج ہونے کے لائق ہے ۔ اس معرکے میں فتحیاب ہو کر راتوں رات آپ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ۔ جسے دیکھو آپ کو مشاعرے کی دعوت دینے کے لیے بے چین ہے ۔ ساتھ ہی درخواست کی جاتی ہے " خدا کے لیے اپنے ہمراہ صرف بیاض لائیے گا ' سانپ نہیں " ۔ ایک مرتبہ ایک دل جلے نقاد نے لکھا " اژدر صاحب کی شاعری کیا ہے ۔ سانپ کی پٹاری ہے ۔ اس میں سے سانپ نکال دیجئے تو پٹاری رہ جاتی ہے وہ بھی خالی " آپ اوور کوٹ پہن کے نقاد کے گھر پہنچے اوپر سے ایک بڑے میاں نے پوچھا" کون صاحب ہیں اور اس ناوقت آمد کی غرض و غایت کیا ہے ۔ ؟

آپ نے بلند آواز میں کہا ۔

" غالبا آپ ہی نامور نقاد جناب چنگیز باقر خانی ہی ؟ "

باقر خانی صاحب نے منہ بنا کر کہا ۔

" جی ہاں ۔ مگر آپ کی تعریف ۔ اور آمد کا مقصد ؟

بولے " تعریف کو چھوڑیئے ۔ محض یہ بتانے حاضر ہوا تھا کہ میرے پس کوئی پٹاری نہیں ' اوور کوٹ ہے ۔ سانپ اسی میں رکھتا ہوں ۔ اس وقت بھی وہ میرا ہمسفر ہے اور اب شرف باریابی کی اجازت چاہتا ہے ۔ کہیے تو آپ کی طرف فی الفور روانہ کروں ؟"

نقاد سہم کر چیخ اٹھا ۔ ساری اکڑ فوں دھری رہ گئی ۔ کہنے لگا ۔

" ابھی اور اسی وقت ایک معرکہ آرا مضمون آپ کی شاعری کی مدح و ستائش میں لکھتا ہوں ۔ غصہ تھوک دیجئے اور گھنٹہ بھر بعد اوور کوٹ اور سانپ کے بغیر تشریف لائیے اور اپنا مضمون وصول کیجئے ۔

دیگر شاعروں کی طرح دنیا نے آپ سے بھی اچھا سلوک نہیں کیا ۔ چنانچہ

آپ نے ناقدر فن سے دل برداشتہ ہو کر اوور کوٹ اور سانپ بیچ دیا۔ اور ایک حکیم صاحب کے مطب میں ملازمت کر لی۔ پہلے ہی دن حکیم صاحب کو آپ کے کوائف معلوم ہو گئے تھے لہٰذا اسٹامپ پیپر پر لکھوا لیا کہ مطب میں ملازم ہونے کے بعد آپ کبھی کشتہ جات کو ہاتھ نہیں لگائیں گے اور اوور کوٹ نہیں پہنیں گے۔ سانپ نہیں پالیں گے۔ شاعری نہیں کریں گے۔

آپ نے بلا چون چرا ساری شرائط مان لیں۔ بس آخری شرط ذرا کڑی معلوم ہوئی کیونکہ اکثر دل سے ہوک اٹھتی اور دوائیں کوٹتے کوٹتے چیخ پڑتے۔ قبلہ حکیم صاحب دیکھئے کیا صاف زبان کا شعر ہوا ہے۔"

حکیم صاحب ڈانٹ کر نصیحت کرتے۔

"سنبھال کے رکھیئے میاں۔ سنبھال کے۔ زبان سنبھالنے کی چیز ہوتی ہے لٹانے کی نہیں"

سنا ہے اب آپ نے خود کو لکھنؤی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

ہماری خدمات پھر حاضر ہیں

باہر سے ہماری دکان پرانے ٹائروں کی ایک عام سی دکان نظر آتی ہے لیکن جب آپ اندر آتے ہیں تو سامنے لگا ہوا بورڈ آپ کے قدم روک لیتا ہے اس بورڈ پر لکھا ہے۔

ہمارے ہاں بلوے فساد کے لیے سڑکوں پر جلانے اور دھواں پھیلا کر ہجوم کو منتشر کرنے والے پرانے ٹائر رعائتی قیمت پر دستیاب ہیں۔

ہم محض پرانے ٹائر ہی نہیں بیچتے بپھرے ہوئے ہجوم کے ذوق کی تسکین کے لیے پرانی اینٹیں اور پتھر بھی فراہم کرتے ہیں۔ تاکہ پولیس سے دو بدو مقابلے کی صورت میں عوام پتھراؤ کرنے کیلئے اینٹیں اور پتھر ڈھونڈنے

کے لئے ادھر ادھر نہ بھاگتے پھریں ۔ یہ چیزیں ان کی تحویل میں ہوں تا کہ بوقت ضرورت کام آسکیں ۔ ہماری ایک برانچ اگلے چوک پر ہے ۔ اس میں بھائی عبدالشکور صاحب بیٹھتے ہیں ۔ مگر اس برانچ میں ٹائر ' اینٹ اور پتھر فروخت نہیں ہوتے ۔ اس کا طریق کار ذرا مختلف ہے ۔ مثلاً آپ ایک سیاسی جلسہ کرنا چاہتے ہیں مگر انتظامیہ نے آپ کے مطلوبہ پارک میں پانی چھوڑ رکھا ہے ۔ لہٰذا آپ وہاں جلسہ نہیں کر سکتے ۔ ایسی صورت میں ہم آپ کو کرائے کے لیے جگہ فراہم کر سکتے ہیں ۔ اس جگہ آپ پانی ' بجلی ' پولیس کی یلغار اور مخالف جماعتوں کے متوقع حملوں سے بچ جاتے ہیں ۔ اس بچاؤ کے لیے ہم اپنی گارڈ فراہم کرتے ہیں ۔ اور جب بل بنا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو کرسیوں ' قناتوں ' دریوں ' لاؤڈ اسپیکروں ' بینروں ' پوسٹوں اور حفاظتی دستے کے علاوہ اپنی فراہم کردہ جگہ کا کرایہ بھی وصول کرتے ہیں ۔ ایک دو لاکھ سے کم کا آرڈر ہم قبول نہیں کرتے ۔ کیونکہ ہمیں اپنی کمپنی کا میعار بھی برقرار رکھنا ہے اور کاروباری ساکھ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر للو پنجو پارٹی یا جماعت کو گاہک بنانے سے پرہیز کیا جائے ۔ کبھی کبھی ہمارے پاس ایسی پارٹیاں بھی آتی ہیں جن کا مسئلہ حاضرین یا سامعین ہوتے ہیں ۔ ایسے پرجوش سامعین جو بیچ بیچ میں نعرے بھی لگا سکیں ۔ ہم اس قسم کے جوشیلے اور نعرے باز سامعین بھی فراہم کرتے ہیں ۔

بالکل خاموش رہ کر تقریریں سننے والے سامعین کی فراہمی کے فی کس ریٹ مختلف ہیں ۔ نعرے بازوں کے ریٹ مختلف ہیں ۔ اسٹیج پر چڑھ کر موقع و محل کے مطابق نظمیں ' ترانے یا قوالیاں گانے والے بھی ہم آرڈر پر فراہم کرتے ہیں ۔ ہمارے اسٹاک میں ہمیشہ دو تین شاعر فالتو پڑے رہتے ہیں ۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی بھی مقبول فلمی گیت کو دھن سمیت آپ کی مطلوبہ نظم کی صورت میں ڈھال سکتے ہیں ۔ گا سکتے ہیں ۔ اور مجمع سے بار بار تالیاں بجوا سکتے ہیں ایک سوال آپ یقیناً ہم سے

کریں گے کہ ہم اتنی ورائٹی کہاں سے لے آتے ہیں ۔ اتنی اقسام کے لوگ کس طرح فراہم کر دیتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ بھائی عبدالشکور کسی زمانے میں سیاسی لیڈر رہ چکے ہیں ۔ بار بار کی ناکامیوں سے انہوں نے جتنے سبق سیکھے ہیں ان سب کو کاروبار میں لگا دیا ہے ۔ الحمدللہ ' اب ہم شہر بھر میں ہول سیل ڈیلرز کے طور پر مشہور ہیں ۔ ایک بنگلہ کراچی میں ہے ' ایک اسلام آباد میں ' ایک لاہور میں اور ایک پشاور میں ۔ گاڑیاں بھی اللہ کے فضل سے ان گنت ہیں ۔ دونوں بھائیوں نے ماشاء اللہ شرعی تقاضے بھی پورے کر رکھے ہیں ۔ یعنی چار چار بیویوں کے شوہر ہیں ۔ سرکار دربار میں بھی آپ کی دعا سے خاصی رسائی ہے ۔ جو ہم دونوں بھائیوں کو دیکھتا ہے سبحان اللہ کہتا ہے ۔ کیونکہ ہم دونوں کی توندیں ڈنلپ ٹائیروں کی طرح کشادہ اور مضبوط ہیں ۔ مصروفیت اتنی ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی جگہ سے اٹھنے اور حوائج ضروریہ تک کی فرصت نہیں ملتی ۔ اگر اٹھنا پڑے تو ہم خود نہیں اٹھتے اس کام کے لیے چار چار ہٹے کٹے ملازم رکھے ہیں ۔ ہمیں اٹھانے بٹھانے کی ڈیوٹی وہ سر انجام دیتے ہیں ۔ ٹیلی فون ملانے کا کام ہم نے ایک آہو چشم اور غیرت ناہید قسم کی سیکرٹریوں کے سپرد کر رکھا ہے ۔ ٹیلی فون غیر ضروری ہو تو وہ خود ہنس ہنس کر اٹنڈ کر لیتی ہیں ۔ ضروری ہو تو ریسیور اٹھا کر ہمارے کان سے لگا دیتی ہیں ۔

بھائی عبدالشکور کو کھانسی بہت آتی ہے ۔ وہ ہیلو کے بعد کھانستے اور ہانپنے لگتے ہیں ۔ میری زبان تھوڑی سی لکنت زدہ ہے لہٰذا میں ایک بات آدھ گھنٹے بعد مکمل کرتا ہوں ۔ اس طرح مخاطب سے میری دوستی گہری ہو جاتی ہے ۔ بہرحال یہ تفصیلات اس لیے پیش کر دیں کہ اگر آپ کی کوئی پارٹی ہے اور اس کے لیے جلسہ عام کا کوئی پروگرام آپ کے ذہن میں کلبلا رہا ہے تو جگہ اور سامعین وغیرہ کے علاوہ مقررین کی بھی کمی ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا ۔ بھائی عبدالشکور سے مل دیکھیے ۔ انشاء اللہ گوہر مقصود ہاتھ آجائے گا ۔ ہاں اگر کبھی بلوے فساد کے لیے پرانے ٹائر

جلانے یا پولیس پر پتھراؤ وغیرہ کرنے کا شوق ہو تو نیاز مند کو یاد رکھیے۔

ویل کم 'گاما بھنڈی'۔

مبارک ہو۔ عنقریب روزنامہ "پیاز" اجراء ہونے والا ہے۔ ڈیکلریشن کی حالیہ فراخدلانہ پالیسی کے نتیجے میں جہاں کئی گمنام لوگوں کو صحافی کہلانے کا موقع ملا ہے وہیں ہماری گلی کے سبزی فروش عام محمد عرف گما بھنڈی توری کو بھی وزیٹنگ کارڈ چھپوانے اور اپنے نام کے نیچے موٹے موٹے لفظوں میں ایڈیٹر۔ پرنٹرز پبلشر" لکھوانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ کل تک ہم اسے گما بھنڈی توری کہہ کر پکارتے تھے بلکہ محلے کے بعض قدیم باشندے تو گامے کا تکلف بھی نہیں کرتے تھے محض اوئے "بھنڈی" توری کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن اب احتیاط کرنی پڑے گی کیونکہ اس کے نام کے ساتھ کچھ سابقے لاحقے عہدے اور منصب لگ گئے ہیں گما اب گما نہیں رہا۔ ایڈیٹر' پرنٹرز اینڈ پبلشرز بن چکا ہے عنقریب وہ میدان صحافت میں کود پڑے گا اور اپنی دوکان کی بوسیدہ گلی سڑی اور ناقابل استعمال سبزیوں کی ٹوکریوں کے درمیان پھلوں کے ٹوٹے ہوئے کریٹ پر بیٹھنے کے بجائے وی آئی پی (حضرات و خواتین) کی پریس کانفرنس میں نظر آیا کرے گا کبھی فائیو اسٹار ہوٹلوں کے اجلاس اٹینڈ کرے گا کبھی وزیروں اور مشیروں کے ساتھ چائے یا لنچ وغیرہ کی میز پر دکھائی دیا کرے گا ایکری ڈیشن کارڈ اس کی جیب میں ہوا کرے گا اور صحافیوں کی صف میں شامل ہو کر ان سب مراعات کا مستحق ہو جائے گا۔ جن کا ایک غیر صحافی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس کے لچھن تو اسی دن سے کچھ بگڑے بگڑے نظر آنے لگے تھے جب ڈیکلریشن کے سلسلے میں غیر ضروری طوالت وغیرہ میں خاتمے کی خبر آئی تھی۔ پھر جب ہر زید بکر عمر کو آسانی سے ڈیکریشن ملنے لگا تو غلام محمد عرف

گلا بھنڈی توری کیوں پیچھے رہتا اس نے بھی ایک درخواست بغرض ڈیکریشن داغ دی ۔ البتہ ہم پر ذاتی کرم یہ کیا کہ ہمیں پڑھا لکھا سمجھ کر درخواست فارم وغیرہ ہم سے پر کروایا اور اب اپنے منہ سے ہم اپنی تعریف کیا کریں بہرحال روزنامہ " پیاز " کا نام بھی ہمارا تجویز کردہ ہے حالانکہ گلا تو مصر تھا کہ اخبار کا نام زور دار ہونا چاہئے ۔ توپ ، تفنگ ، پستول ، کلاشنکوف وغیرہ ۔ لیکن ہم نے سمجھایا کہ اخبار کا کام ہے عوام کو حالات سے باخبر رکھنا ۔ اس قسم کے ناموں سے لوگ بدک جائیں گے کوئی اخبار نہیں خریدے گا ۔ اسپر اس نے بھی اپنی کھوپڑی سہلائی اور ادرک ، لہسن ، پودینہ ، بھنڈی ، ٹماٹر اور گھیا توری سے ہوتا ہوا بالآخر پیاز پر متفق ہو گیا کہ یہ ایسی سبزی ہے جس کے بغیر کوئی سالن مکمل نہیں ہوتا ۔ یہ نکتہ ہم نے اسے سمجھایا کہ جس طرح پیاز کو سبزیوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اسی طرح روزنامہ " پیاز " کو بھی روزناموں میں ایک انفرادی تشخص کا حامل ہونا چاہئے ۔ چنانچہ عنقریب روزنامہ " پیاز " کا اجراء ہونے والا ہے ۔

مولانا ظفر علی خاں کے دور میں صحافت عبادت کا درجہ رکھتی تھی اس سے بھی پہلے کی تاریخ کھنگالیں تو معلوم ہو گا کہ صحافت کرنا یا صحافی بننا بچوں کا کھیل نہیں تھا ۔ اس بحر کے شناوروں نے بڑے بڑے اصول وضع تھے بڑے بڑے تجربات سے گزرے تھے خبر کی سچائی ، نیت کی پاکیزگی اور حرف کی حرمت کے لئے مرمٹے تھے انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کہا کہ صحافت کا تقدس پامال نہ ہو ۔ یہ راستہ ، محترم اور معتبر کہلائے ۔ لیکن غلام محمد عرف گلا بھنڈی توری جیسے لوگوں نے شیشے جیسے شفاف اس پانی میں گھس کر اسے اتنا گدلا کر دیا کہ اب یہ پینے کے قابل رہا نہ صورت دیکھنے کے لائق ۔ ہر چند کہ پیشہ صحافت میں اب اچھے لوگوں ، دیانت دار کارکنوں ، حرف کی حرمت پر مرمٹنے والوں کی کمی نہیں ۔ سو پچاس صحافیوں میں ایک آدھ سچا اور اچھا دانہ مل ہی جاتا ہے مثلاً غلام محمد عرف

گاما بھنڈی توری لیکن ہمیں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ توقع رکھنی چاہئے کہ گاما ایک دن اس ملک کا سب سے بڑا جرنلسٹ ہو گا۔ سردست تو وہ اپنے اخبار کا اجراء اپنی جھلا نما دوکان ہی سے کرا رہا ہے لیکن دن آئے گا جب وہ ساری بلڈنگ خالی کروا کے خریدے گا اور اس پر جہازی سائز نیوئن سائن جگمگایا کرے گا۔ روزنامہ "پیاز" لمیٹڈ

اس بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ایک عدد ریسپشنسٹ آپ کا راستہ روک لے گا۔ وہاں بھاری توندوں اور کھڑی مونچھوں والے ریسپشنسٹ آپ سے اس قسم کی باز پرس کرے گا۔

"کیا کام ہے جی۔ کس سے ملنا ہے؟"

"گاما بھنڈی توری سے ملنا ہے جناب"

"سوری جی۔ اس نام کا کوئی شخص ہمارے ادارے کا ملازم نہیں"۔

"ملازم نہیں۔ مالک ہیں جناب وہ"

"تو ٹھیک نام لیں نا۔۔۔ ان کا نام ہے الحاج غلام محمد صاحب

"چلیں انہی سے ملا دیں"

"وہ فرینکفرٹ گئے ہوئے ہیں"

"کیا کرنے؟" (ٹینڈوں کا بھاؤ پتہ کرنے)

"وہ عالمی اقتصادی امور کی سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کے لئے بطور مندوب تشریف لے گئے ہیں"

فون پر بھی گاما آپ کو کبھی دستیاب نہیں ہو گا۔ اول تو ہمیشہ ٹیلی فون ایکچینج ملے گا اگر خوش قسمتی سے لائن مل بھی گئی تو گاما نہیں ملے گا اس کی پرائیویٹ سیکرٹری کی کھنکتی ہوئی آواز جو پہلے آپ کے سارے کوائف معلوم کرے گی پھر رٹا رٹایا جواب دے گی۔ "حاجی صاحب بیرون ملک دورے پر تشریف لے گئے ہیں کوئی ضروری پیغام ہو تو لکھوا دیں۔ ورنہ لائن فارغ کر دیں۔۔۔"

خیر یہ تو مستقبل کی خوشگوار امیدیں ہیں سردست تو یہ دیکھنا ہے کہ گامے

کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی ۔ اس نے کچھ کرنا بھی تھا تو آلو پیاز کی فیلڈ میں کرتا ۔ وادی صحافت کا رخ اس نے کیوں کیا ۔ یہ سوال جب ہم نے اس سے کیا تھا تو وہ برا مان گیا اسے اعتراض یہ تھا کہ جب اس ملک کے گریجوئیٹ اور پوسٹ گریجوئیٹ ٹھیلہ لگا سکتے ہیں رکشہ چلا سکتے ہیں ۔ بوٹ پالش کا اجتماعی سٹال لگا سکتے ہیں تو ایک سبزی فروٹ صحافی کیوں نہیں بن سکتا ۔ جبکہ ڈیکلریشن کا حصول بھی دشوار نہ ہو ۔ بلکہ اس میں حائل بہت سی دشواریوں کا خاتمہ بالخیر ہو چکا ہو ۔

ممکن ہے کچھ لوگ اس خبر پر جز بز ہوں چیں بہ چیں ہو ۔ صدق دل سے گامے کے اخبار اور اس کی صحافیانہ حیثیت کو تسلیم نہ کریں ہمیشہ اس سے روزنامہ "پیاز" کی بجائے تازہ پیاز کا بھاؤ پوچھیں لیکن اس قسم کی باتوں سے گاما دل برداشتہ ہونے والا نہیں ۔ اسے معلوم ہے کہ کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑی میں داخل ہونے والی سواری کو بالآخر سیٹ مل ہی جاتی ہے اس اسٹیشن پر نہ سہی ' اگلے اسٹیشن پر سہی ۔ گاڑی میں داخل ہونا شرط ہے اور آج کل تو اس گاڑی کے تمام دروازوں پر "ویل کم" کے بینر لہرا رہے ہیں ۔

اپنا الو سیدھا کروائیے

یوں تو دانشوروں کی کئی قسمیں مگر ایک قسم زیادہ مشہور ہے ۔ یہ اخباری دانشور کہلاتے ہیں خبروں اور دعوت ناموں میں ان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ مشہور دانشور ' مثلاً مشہور دانشور غلام قادر عاقل ہوشیارپوری یا مشہور دانشور خلجان وزیر آبادی وغیرہ تو کہنے کا مطلب یہ کہ اگر آپ کا تعلق دانشوروں کے حلقے سے ہے تو آپ نے ہماری دکان ضرور دیکھی ہو گی ۔ جس کے بورڈ پر لکھی ہوئی عبارت دور ہی سے دامان نظر کھینچ لیتی ہے ۔

اپنا الو سیدھا کروائیے

نیز ہمارے ہاں ہر قسم کے الو بکثرت پائے جاتے ہیں ٹیڑھے الووں کو سیدھا کرنا۔ سیدھے الووں کو ٹیڑھا کرنا ان کے ڈینٹ اور چپ نکالنا۔ انہیں کار آمد یا ناکارہ بنانا۔ یہ تمام کام ہماری ورکشاپ میں تسلی بخش ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنا الو سیدھا کروانا ہو یا الووں کی خرید و فروخت مطلوب ہو تو ہم سے رجوع کیجئے۔ تھوک کے علاوہ پرچون بھی دستیاب ہے۔ الو اینڈ کمپنی۔ بالمقابل عصری دانش گاہ متصل انجمن دانشوران عصر حاضر۔ نزد مسٹل ہاسپٹل۔

پہلے پہل ہم نے اپنا کاروبار الووں کے ایک جوڑے سے شروع کیا تھا جو سارا سارا دن پنجرے میں پلکیں جھپکاتا رہتا تھا۔ بعد میں اللہ نے ہمارے کاروبار میں برکت دی اور دو سے چار اور چار سے آٹھ الو ہو گئے۔ اب تو ماشاء اللہ الووں کی اتنی کثیر تعداد ہماری دکان میں جمع ہے کہ کبھی کبھی تو ہم پریشان ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ اتنے الووں کا کیا کریں۔ ہم نے محض شوق میں الووں کا جوڑا خرید لیا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسا وقت بھی ہم پر آئے گا جب گاہک ہم پر ہاتھ رکھ کر پوچھے گا۔ اس الو کی کیا قیمت ہے جی"

کئی دفعہ گاہکوں سے ہمارا اس بات پر جھگڑا ہو چکا ہے کہ انہیں الووں اور بندروں کی تمیز نہیں رہی۔ دکان میں گھستے ہیں۔ بھانت بھانت کے الو دیکھتے ہیں اور بالآخر ہم پر انگلی رکھ دیتے ہیں۔ "کیا قیمت ہے جناب؟" روز روز کی اس پریشانی اور عوام کی الو ناشناسی دیکھ کر ہم نے دو قسم کی تختیاں موٹے حروف میں لکھوا کر دکان میں لٹکا دی ہیں۔ ایک پر لکھا گیا ہے۔

دکاندار برائے فروخت نہیں ہے
براہ کرم اپنا وقت ضائع نہ کریں

دوسری تختی پر ہم نے مزید موٹے لفظوں میں لکھوایا ہے۔

یہ اس دکاندار کے پروپرائیٹر ہیں
الو صرف پنجروں میں بند ہیں

براہ کرم الووں سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔

کچھ لوگ اندر آتے ہی مختلف الووں سے چھیڑ چھاڑ یعنی سیاسی گفت و شنید شروع کر دیتے ہیں۔ بعض انتہائی بے تکلف ہو کر الووں سے پوچھ بیٹھتے ہیں " اور سناؤ بھائی جی مزے میں ہو۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہمارے پالتو الو ہر قسم کی باتیں برداشت کرتے لیکن سیاسی گفتگو پر آنکھیں موند کر منہ پھیر لیتے ہیں یا سر نیہوڑا لیتے ہیں۔ ویسے یہ بات نہیں کہ وہ مردہ دل ہیں یا کسی قسم کے سیاسی تعصب کا شکار ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنی شناخت الو کے طور پر چاہتے ہیں۔ سیاسی دانشور یا مبصر کی حیثیت سے نہیں۔

ہم نے الووں کو سدھانے اور انہیں سیدھا کرنے کے لیے باقاعدہ ایک ورکشاپ بنا رکھی ہے۔ اس ورکشاپ میں ہم نے سارا جدید ادب رکھ چھوڑا ہے۔ ادبی جلسوں کی کاروائیوں کے موٹے موٹے رجسٹر اور ثقیل اور نا قابل فہم قسم کے ضخیم تحقیقی مقالے جس الو کو سیدھا کرنا مقصود ہو ہم اس کے پر نہیں اکھیڑتے۔ اسکی چونچ کو شکنجے میں نہیں کستے۔ اسے کسی قسم کی اذیت نہیں دیتے۔ بس خاموشی سے پنجرے کا دروازہ کھولتے ہیں اور گردن سے پکڑ کر اسے ورکشاپ میں دھکیل دیتے ہیں۔ دو چار روز بعد نکالتے ہیں تو ٹیڑھے سے ٹیڑھا الو بھی سیدھا ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زیادہ دن ہمارے ٹکتا نہیں۔ موقع پاتے ہی پھر سے اڑ جاتا ہے اور کسی ادبی تنقیدی اجلاس میں جا کر اپنے دانشور ہونے کا ثبوت دینے لگتا ہے۔ جب ہم اپنے الووں کی آمد و خرچ کا حساب کتاب لگانے بیٹھتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ ہمارا فلاں الو غائب ہے۔ ہمیں اس انکشاف پر دکھ نہیں ہوتا خوشی ہوتی ہے کہ چلو دانشوروں کے حلقے میں ایک اور دانشور کا اضافہ ہوا۔۔۔ اللہ تیرا شکر ہے۔

میڈم سو رہی ہیں

ایک دور تھا کہ ہم فلمی پریوں کے عاشق تھے اور جنات کی طرح ان کا طواف کرتے تھے۔ ان سے انٹرویو کرتے تھے اور ان سے گفتگو کر کے مشام جاں کو معطر رکھتے تھے کون سی اداکارہ گوبھی گوشت پسند کرتی ہے۔ کس اداکارہ کے کس شوہر نے کس بات پر اسے کب طلاق دی، کس اداکارہ کو کون سی خوشبو پسند ہے۔ کس اداکارہ نے اپنے پرستاروں کے نام کیا پیغام دیا ہے۔ کس اداکارہ کے اپینڈکس کا آپریشن کب ہوا۔ کس اداکارہ نے کتنے لاکھ میں کون سی کوٹھی کہاں بنوائی۔ یہ اور اس قسم کے ہزاروں سوالات کے جوابات سیاق و سباق کے ساتھ ہمیں یاد تھے۔ لوگ ہماری ہیروئن شناسی پر فخر کرتے تھے اور ہیروئنوں کے سلسلے میں جب کوئی سوال انہیں پریشان کرتا تھا تو وہ ہم سے رجوع کرتے تھے۔

مگر اب مدت سے ہم نے یہ شغل ترک کر دیا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اب ہم ہیروئنوں سے انٹرویو نہیں کرتے۔ ہم بات ٹالنے کے لیے یا تو موسم کا ذکر لے بیٹھتے ہیں یا مہنگائی کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ یا آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ اب ہر شخص کو کون بتاتا پھرے کہ انٹرویوز سے ہمارے فرار کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ یہ اچھا بے ضرر اور دلچسپ شغل ہم نے ترک کیوں کر دیا۔

مبارک علی دل پھینک نوجوان صحافی ہیں۔ حال ہی میں ایک شو بزنس میگزین سے وابستہ ہوئے ہیں خاصے پرعزم ہیں اور بغل میں ڈائری اور کندھے پر کیمرہ لٹکا کر صبح گھر سے نکلتے ہیں رات کو پولیس ناکوں سے شناخت کروا کے واپس گھر لوٹتے ہیں۔

ایک روز انھوں نے ہمیں سینئر صحافی کہہ کر ہمارے تجربات سے افادے کے لئے ہماری وہ پرانی نوٹ بک برائے مطالعہ مستعار مانگ لی جس میں

فلمی پریوں اور فلمی جنات وغیرہ کے فون نمبر درج تھے ۔ اس بوسیدہ ' کرم خوردہ اور خستہ حال ڈائری کا انہوں نے تین چار دن تک مطالعہ بغور فرمایا اور ان ریمارکس کے ساتھ ڈائری ہمیں واپس کر دی ۔

" آپ نے تو جناب مجھے مصیبت میں پھنسا دیا ہے "

ہم نے پوچھا " عزیز من ۔ وہ کس طرح ؟

کہنے لگے ۔ جو نمبر ڈائل کرتا ہوں آگے سے جواب ملتا ہے سوری رانگ نمبر ۔ "

ہم نے کہا ۔ " عزیز من ڈائری کے سال اشاعت پر بھی غور کر لیتے ۔ بہرحال آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نمبر بدل گئے ہیں اور نئے نمبر ہمارے پاس نہیں ہم یہ شعبہ چھوڑ چکے ہیں ۔

وہ مایوس ہو کر چلے گئے ۔ چند دنوں بعد ایک تقریب میں ملاقات ہوئی خاصا چہک رہے تھے ۔ کہنے لگے ۔ مبارک ہو جناب ۔ میں نے بہت سے نمبر ٹریس آؤٹ کر لئے ہیں ۔ بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں ۔

ہم نے کہا " چلئے اچھا ہوا ۔ آپ کی پریشانی دور ہوئی ۔ "

کہنے لگے " دور کہاں ہوئی صاحب ' پریشانی تو اب شروع ہوئی ہے "

ہم نے پوچھا ۔ " اب کیسی پریشانی ؟

بولے " جو بھی نمبر ڈائل کرتا ہوں آگے سے جواب ملتا ہے میڈم شوٹنگ پر ہیں ۔ اسٹوڈیو سے رابطہ کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے میڈم ابھی نہیں پہنچی ۔

ہم نے کہا ض اس کا بہتر حل یہ ہے کہ آپ خود اسٹوڈیو چلے جائیں اور جس کا انٹرویو کرنا ہو اس مل لیں ۔

بولے " یہ بھی کر چکا ہوں ۔ لیکن بات نہیں بنتی ۔ جس ہیروئن کا انٹرویو کرنے جاتا ہوں اول تو وہ ملتی نہیں ' مل جائے تو بات نہیں کرتی ۔ بات کرے تو انٹرویو نہیں دیتی انٹرویو دے دے تو تصویریں نہیں دیتی ۔ گھر جا کر ملنا چاہتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ میڈم سو رہی ہیں ۔ "

ہم نے کہا " خیر۔ گھبرانے کی بات نہیں اس فیلڈ میں ایسا ہوتا ہے۔ آپ اپنی دھن میں لگے رہیں۔ کامیاب ہو جائیں گے۔
اس پر انھوں نے وعدہ کیا کہ ہمارے مشورے پر عمل کریں گے اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔
کچھ عرصے بعد وہ بڑے مایوس دل گرفتہ اور پریشان حال ہمارے پاس آئے ' کہنے لگے " جناب ' میرے ساتھ بہت برا ہوا "
ہم نے انہیں تسلی دی۔ چائے منگوائی اور ان کی درد بھری عبرت انگیز داستان سننے لگے۔
انہوں نے بتایا کہ پچھلے چند دنوں سے ان کے ذہن میں ایک ہی دھن سوار تھی کہ فلاں ہیروئن کا انٹرویو کریں۔ جب بھی گھر پہ فون کیا ' معلوم ہوا میڈم سو رہی ہیں۔ ایک روز انہیں ضد ہو گئی کہ بہر صورت میڈم کو جگا کے رہیں گے ' لہٰذا انہوں نے صبح دس بجے میڈم کو فون کیا۔
معلوم ہوا میڈم سو رہی ہیں۔
دل پھینک نے پوچھا " کب جاگیں گی "
جواب ملا " بارہ بجے پتہ کریں "
انہوں نے ٹھیک بارہ بجے پتہ کیا۔ معلوم ہوا میڈم بدستور سو رہی ہیں۔ آپ چار بجے پتہ کریں۔ انہوں نے چار بجے فون کیا۔ وہی جواب ملا۔ چھ بجے فون کیا۔ وہی جواب ملا۔ سات بجے فون کیا تو معلوم ہوا کہ اسٹوڈیو تشریف لے گئی ہیں۔ شوٹنگ پر۔ اسٹوڈیو گیا تو معلوم ہوا کہ میڈم نہیں پہنچیں ' کیونکہ آج ان کی کوئی شوٹنگ نہیں۔ وہ گذشتہ بیس دن سے آؤٹ ڈور کے لیے چترال گئی ہوئی ہیں۔
مبارک علی چل پھینک نے ایک تھکی تھکی جمائی لے کر کہا " اب یہ حالات ہیں آپ خود سوچیں ' فلمی صحافت کیا خاک ترقی کرے گی۔ میں تو تنگ آکر سوچ رہا ہوں کہ فیلڈ ہی چھوڑ دوں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔؟
" آپ تو میاں اب اس فیصلے پر پہنچے ہیں ' ہم نے تو یہ فیصلہ برسوں پہلے

کر لیا تھا' پہلے میڈمیں سوتی تھیں ' اب ہم سوتے ہیں اور چین ی نیند سوتے ہیں۔

اگر اقبال زندہ ہوتے

ویسے تو اقبال ہمارے ذہنوں اور درسی کتابوں میں زندہ ہیں لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر اقبال سچ مچ زندہ ہوتے تو قوم ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتی۔ شاعروں کے معاملے میں تو اب تک قوم نے یہ کیا ہے کہ مشاہرے میں گئے تو ہونگ کر دی۔ پولیس کی نفری زیادہ ہوئی اور ہونگ کی گنجائش نہ دیکھی تو اشعار نوٹ کرنے بیٹھ گئے۔ شاعر کا آدھا شعر نوٹ کیا آدھا اپنی طرف سے بنایا اور اس طرح اپنی شعر فہمی اور علم دوستی کا ثبوت دے دیا۔ زیادہ بڑی سطح پر یوں کیا کہ انہیں نصاب میں شامل کر دیا۔ ایک آدھ ادبی انعام دے دیا۔ شاعر جب تک زندہ رہا اسے شاعر تسلیم نہیں کیا۔ فوت ہو گیا تو دل پر پتھر رکھ کے اس کی ذات اور فن کو اسکالروں کے سپرد کر دیا کہ جی بھر کے اس کی پوسٹ مارٹم تیار کریں۔ اس سے زیادہ شاعروں کی حوصلہ افزائی کے ہم قائل نہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اچھے کلام پر شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا' اب موتی نایاب اور شاعر بے حساب ہیں۔ آدمی کس کس کا منہ موتیوں سے بھرے۔ خدانخواستہ اگر کوئی موتی کس کے حلق میں اٹک جائے تو لینے کے دینے پڑجائیں۔ پرانے زمانے کے حاکم دل سے سوچتے تھے۔ دماغ کو سوچ بچار جیسی فضول چیزوں سے بچا کر رکھتے تھے۔ دماغ صرف جنگوں میں استعمال کرتے تھے۔ وہ بھی اپنا نہیں۔ سپاہیوں کا۔ اب ہمارے حاکم ہندسوں میں سوچتے ہیں۔ شاعر کی قیمت اس کے کلام سے نہیں لگاتے اس کی واسنگیاں دیکھتے ہیں۔ اس کے نام کوئی چیک جاری کرنے سے پہلے اس کا کلام نہیں اس کا بائیو ڈیٹا سامنے رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا

وقت بھی بچ جاتا ہے۔ منصفی کے کاغذی تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ جس شاعر نے شعر اچھا کہا ہو مگر لابی مضبوط نہ ہو تو زندگی بھر فعلن مفعولن فعلات ہی کرتا رہتا ہے۔ کسی انعام یا اعزاز یا اعزاز پذیرائی کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ اور اقبال تو شروع ہی سے لابیوں کے خلاف تھے۔

بتان رنگ بو کو توڑ کے ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

ایسے شاعر کو ہم انعام کیوں دیتے جو لابیاں بنانے کی بجائے ان کو توڑنے کی فکر میں۔ اگر بھولے چوکے ان کو کسی ادبی انعام کے لیے نامزد بھی کر دیا جاتا تو کوئی منصف سر کھجا کر ضرور پوچھتا۔ "یہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کون ہیں۔ ان کا کلینک کہاں ہے؟۔

دوسرے صاحب کہتے۔ "ارے بھئی یہ نظریہ خودی والے ڈاکٹر ہیں"۔

تیسرے صاحب کہتے۔ "انہیں تو پہلے ہی انگریزوں سے سر خطاب مل چکا ہے اب مزید ہم سے کیا چاہتے ہیں"۔

یہاں منصف کنپٹی سہلا کر کہتا "مصیبت یہ ہے کہ ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کا نام منسٹری سے ریکمنڈ ہو کر آیا۔ غالباً منسٹری میں ان کا کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔"

دوسرا منصف تذبذب آمیز لہجے میں کہتا۔ "ٹھیک ہے ووٹنگ کر لیتے ہیں کیونکہ ہمیں استاد کالو بخش کا بھی خیال رکھنا ہے۔ ان کا نام بھی منسٹری سے ریکمنڈ ہو کر آیا ہے۔ ویسے بھی وہ کام کے آدمی ہیں۔ بجلی کے محکمے میں لائن سپرنٹنڈنٹ ہیں"۔

اقبال حکیم الامت ہیں۔ قوم کے دکھ درد کا علاج اپنے کلام سے کرتے تھے۔ اب ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور ٹیلی پیتھی کا زمانہ ہے۔ قوم کے ہر قسم کے درد کا آدھا علاج تو ڈاکٹر کی فیس ادا کرتے وقت ہو جاتا ہے باقی ماندہ کسر کیمسٹ پوری کر دیتا ہے۔ حکیموں کا رخ لوگ صرف اسی وقت کرتے ہیں جب ایلوپیتھک ڈاکٹروں کی کڑوی کسیلی دواؤں اور کیپسولوں

سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور وہ گاجر یا بڑ کا مربہ کھان چاہتے ہیں۔
اقبال زندہ ہوتے تو ان کے گھر پر حکیم الامت کا بورڈ دیکھ کر کوئی ضرورت مند ضرور ان کہ دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھتا۔ " حکیم صاحب ہیں "
اقبال شفقت سے پوچھتے " فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟ "
مریض کراہ کے کہتا۔ " خدمت تو حکیم صاحب میں آپ کی کروں گا۔ بس ذرا میرا ہاضمہ ٹھیک کر دیں۔ دس دس روٹیاں کھا جاتا ہوں لیکن بھوک پھر بھی نہیں لگتی۔ "
اقبال پریشان ہو کر کہتے " آپ شاید غلط جگہ آگئے ہیں۔ حکیم افراسیاب ساتھ والی گلی میں رہتے ہیں۔ "
حاجت مند زور دے کہتا " نہیں جناب۔ سمجھانے والے نے بالکل ٹھیک پتہ سمجھایا تھا میں لوگوں سے پوچھتا ہوا یہاں آیا ہوں سب نے متفقہ طور پر یہی کہا کہ آپ ہی قوم کے سب سے بڑے حکیم ہیں "
اقبال " اسرار خودی " کا ایک نسخہ دے کر فرماتے۔ " فی الحال تو آپ اس کا مطالعہ کیجئے۔ مرض باقی رہے تو پھر آیئے گا۔ انشاء اللہ آئندہ ضرب کلیم سے آپ کا علاج کروں گا۔
ہمیں یقین ہے کہ ضرب کلیم کی نوبت آنے سے پہلے ہی مریض اپنی شفایابی کا اعلان کر دیتا۔ نئی نسل کے شاہین جنھیں اقبال کے بارے میں صحیح معلومات نہیں لئیق احمد انہیں ذوق آگہی کے کسی پروگرام میں بلوا کر کہتے " ۔ بھئی بچو آج ہم آپ کو ایک ایسے شاعر سے ملواتے ہیں جن کا کلام آپ نے تمام شاعروں سے زیادہ پڑھایا سنا ہو گا۔ "
یہ کہہ کر وہ ایک طرف اشارہ کرتے۔ ایک پردہ اٹھتا اور حکیم الامت ٹہلتے نظر آتے۔ اب سوال کیا جاتا ہے۔ " ہاں بھئی بچو ۔۔ تو یہ ہیں وہ شاعر۔ ذرا پہچانے انہیں کون ہیں ؟
کوئی ذہین بچہ انہیں پہچان کر چلاتا " علامہ اقبال ۔۔ علامہ اقبال "

لئیق احمد بچے کی پیٹھ تھپکتے " شا۔۔ باش خوب پہچانا۔ بھا۔ آپ نے انہیں کس طرح پہچان لیا۔ کیونکہ آپ لوگوں کے ذہن میں تو ان کی تصویر ہے جس میں یہ اپنی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے گہری سوچ میں گم ہیں۔
لڑکا بتاتا۔ " جس طرح یہ ٹہل رہے ہیں اس طرح عام شاعر نہیں ٹہلتے "
کیا مطلب "
لڑکا وضاحت کرتا۔ جی عام شاعر جب ٹہلتے ہیں تو سگریٹ کے کش لگاتے ہیں ساتھ ساتھ گنگناتے ہیں۔ بار بار ایک ہاتھ اپنی جیب میں بھی ڈالتے ہیں۔ تاکہ رقم گن سکیں۔ بیچ بیچ میں بچوں اور بیوی کو بھی آواز دیتے ہیں تاکہ شعر کی جو آمد ہوئی ہے اس سے گھر والوں کو بھی مطلع کر سکیں اور ہو سکے تو محلے داروں کو بھی۔
لئیق احمد حیران ہو کر کہتے " بھئی واہ۔۔ بڑا گہرا مشاہدہ ہے آپ کا۔۔ بھلا یہ باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔
لڑکا شرما کر کہتا " جی میرے ابو شاعر ہیں۔
اقبال زندہ ہوتے تو حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری صاحب ضرور ان کے پاس پہنچتے کہ جناب ہمارے اگلے تنقیدی اجلاس کی صدارت قبول فرمایئے
۔
اقبال کہتے۔ " بھائی میں صدارتوں وزارتوں کے چکر میں نہیں پڑتا "۔
سیکرٹری صاحب انہیں اپنا بھاری بھرکم رجسٹر کھول کر دکھاتے۔ کہتے " بندہ پرور۔ ذرا نام گنتے جایئے۔ کیسی کیسی شخصیات نے ہمارے اجلاسوں کی صدارت کی ہے۔
اقبال کھانس کر کہتے۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر صدارت۔
سیکرٹری صاحب فوراً کہتے " اچھا خیر آپ صدارت قبول نہیں فرماتے تو نہ سہی۔ لیکن ایک درخواست ہماری مان لیجئے۔ اگلے اجلاس میں اپنی کوئی نظم تنقید کے لئے پیش کر دیجئے۔
اپنے تعلیمی اداروں کی حالت زار پر نظر جاتی ہے تو خیال آتا ہے کہ ایک

لحاظ سے اچھا ہی ہے کہ ہم روح اقبال ہی سے شرمندہ ہیں ورنہ اقبال زندہ ہوتے تو ہمیں اقبال سے بھی ندامت ہوتی اور اس ندامت کو دھونے کے لیے آپ زم زم کے کئی کنستر درکار ہوتے۔ اتنا پانی لانے کی اجازت کس کو ملتی اور پرمٹ کون دیتا۔ ہم حاکم کے پاس درخواست لے کر پہنچتے تو وہ بھوئیں میچ کر ضرور پوچھتے "کیوں جی۔ اتنا پانی لانے کی اجازت کس کو ملتی اور پرمٹ کون دیتا۔ ہم حاکم کے پاس درخوست لے کر پہنچتے تو وہ بھوئیں میچ کر ضرور پوچھتے۔ "کیوں جی۔ اتنا آپ زم زم آپ کس لیے لانا چاہتے ہیں۔ کاروبار کا ارادہ ہے"

ہم کہتے "جی نہیں ۔۔ ہم تو اپنی ندامت کو دھونا چاہتے ہیں۔ اس پر وہ جھلا کر ہماری درخواست پر لکھتے "نا منظور" اور گرج کر ہم سے کہتے "خواہ مخواہ آجاتے ہیں وقت ضائع کرنے۔ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں تو میونسپل کارپوریشن کے نلکوں سے بھی دھل سکتی ہیں"

سردار بکھیڑا سنگھ

والئی ریاست ہونے کی وجہ سے سردار بکھیڑا سنگھ کو شاعروں سے بھی واسطہ پڑا۔ ایسا کہ اللہ معافی سیدھے سادے سردار جی تھے۔ نہ شعر پڑھ سکتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے۔ لیکن شاعروں نے مل جل کر ایسی ہوا باندھی کہ اپنے دولت کدے پر مشاعرے کروانے لگے۔ مشاعرہ ایسی لذیذ شے ہے کہ ایک مرتبہ اس کی لت لگ جائے تو آسانی سے چھوٹتی نہیں۔ جتنا اس آگ پر پانی ڈالیے یہ اور بھڑکتی ہے۔ سردار جی کو مشاعرے اتنے پسند آئے کہ ہر چھٹے چھ ماہے کی بجائے ہر ماہ مشاعرہ کروانے لگے۔ یہ سلسلہ ریاست کے انتظامی افسروں سے بھی مزید گہرے تعلقات کا سبب بنا۔ انگریز افسران جنہیں ٹوٹی پھوٹی اردو آتی تھی، اپنی شامیں اور راتیں دلچسپ انداز میں گزارنے کے لئے سردار بکھیڑا سنگھ کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔

بکھیڑا سنگھ نے مشاعروں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ در پردہ ایک استاد کا وظیفہ

باندھ کر انہیں اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ ان کے لیے حسب ضرورت کلام تیار کریں تاکہ سردار جی مشاعروں میں پڑھ کر خراج تحسین حاصل کریں۔ استاد نے ہاتھ لہرا لہرا کے کمر کو بل دے کر اور منہ بنا بنا کر جو طریقے سکھائے وہ ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آئے۔

والئی ریاست تھے اس لیے استاد کو استاد نہیں سمجھتے تھے۔ وظیفہ خوار ملازم سمجھتے تھے اور جیسے ملازموں سے پیش آیا جاتا ہے اسی طرح پیش آتے تھے۔ استاد نے جب شعر کی ادائیگی میں رقص کے پینترے دکھائے تو سردار جی سے ضبط نہ ہو سکا۔ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "بس کرو ماسٹر جی۔ یہ ڈانس ہم سے نہیں ہو سکتا۔ استاد کو ہمیشہ وہ استاد کی بجائے ماسٹر جی کہتے تھے اور استاد اپنے لیے یہ خطاب سن کر بہت کڑھتے تھے۔ بہت سٹپٹاتے تھے۔ مگر ایک کھسیانی ہنسی کے سوا اور کچھ کر نہیں کر سکتے تھے۔

تلفظ شعر کے معاملے میں بکھیڑا سنگھ مکمل بکھیڑا تھے۔ کیا مجال جو شعر کو شعر کی طرح پڑھ دیں۔ ہمیشہ استاد کے شعر کو اپنی پسند اور اپنے انداز کے مطابق نثر بنا کے پیش کرتے تھے۔ استاد نے کہہ رکھا تھا کہ اگر مکرر کی صدا آجائے تو شعر کو دوبارہ پڑھنا چاہیے۔

سردار جی اس بکھیڑے میں نہیں پڑتے تھے جہاں کسی نے مکرر کہا۔ جھٹ مونچھوں پر بل دے کر کہتے "آرام سے بیٹھ اوئے مکرر کے بچے۔ پہلی بار ہی غور سے سن لیا کرو۔ ہم ایک بات بار بار نہیں کرتے۔ دنیا میں اصول بھی کوئی چیز ہے"

جب سردار جی کا نام پکارا جاتا تو ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ چہرہ سرخ اور آنکھیں ہونقوں کی طرح باہر نکلی ہوئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چلتا ہوا۔ خود شہتیر کی طرح ڈگمگاتے ہوئے۔ باچھیں پھیلا کے پہلے تو ایک ایک کا منہ دیکھتے۔ پھر نتھنے پھلا کر مونچھیں مروڑتے۔ ایک ہاتھ خاموش سامعین کی طرف اٹھا کر کہتے "حضرات خاموش، حضرات خاموش" خاموش سامعین اچھل پڑتے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند

ہو۔ بس۔ شاعر حضرات ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے "کیا کہنے ہیں صاحب ' کیا کہنے ہیں ۔ واہ وا۔ لطف آگیا۔
سردار جی ایک ہاتھ شیروانی کے اندر ڈال کے زر بفت اور مخمل کی جلد میں لپٹی ہوئی بیاض نکالتے ۔ صفحات الٹتے پلٹتے ۔ ساتھ ہی ساتھ تقریر بھی فرماتے ۔ " بجنو تے مترو دوستو اور ساتھیو ۔ یہ شاعری چیز ہی غلط ہے ۔ میں تو اس کے بہت برخلاف ہوں ۔ یہ بندے کا گلہ نہیں چھوڑتی ۔ پھر بھی آپ لوگوں کی ذرہ نوازی ہے ۔ کافی کلام تیار کر کے لایا ہوں ۔ میں نے آپ کے لئے ککڑ ' بٹیرے اور تیتر بھی تیار کروائے ہیں ۔ ساری چیزیں کافی مقدار میں ہیں ۔ رج کے کھائیں ۔ لو جی یہ غزل مل گئی ۔ اب آپ ذرا ہوش و حواس ملاحظہ فرمائیں ۔
جناب والا ۔ موتیوں والی سرکار ' الیگزنڈر صاحب ۔ غزل پیش کرتا ہوں ۔ اجازت ہے ؟
انگریز افسر قلقاریں مار کر ہنستا ۔ ہاتھ اٹھا کے کہتا " اجازٹ ہائے ۔ اجازٹ ہائے ۔ ویل ٹم اپنا گل پڑھو ۔ کوئی نہیں بولیں گا " ۔
یہ سن کر شاعر سہم جاتے کہ لیجئے ۔ اب داد دینے سے بھی گئے اچھی زبردستی ہے تاہم آواز کو زیادہ سے زیادہ خوشامدانہ ' کمزور اور عاجزانہ بنا کر داد ضرور دیتے ۔
شاعروں کو صرف اذن باریابی تھا ۔ یعنی آؤ ۔ ادب تمیز سے غزل سناؤ اور رفو چکر ہو جاؤ ۔ نہ انہیں کھانے میں شریک کیا جاتا تھا ۔ نہ گھروں کو چھوڑنے کے لئے کوئی انتظام ہوتا تھا ۔ بچارے شاعر رات گئے بھوکے پیاسے ' اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے ' کتوں سے بچتے بچاتے ' ایک دوسرے کو شعر سناتے گھر پہنچتے اور اپنے اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہی چیخنے ' چنگھاڑنے لگے ۔ " مبارک ہو بیگم ۔ مبارک ہو ۔ جلدی سے کھانا نکلواؤ ۔ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہے مشاعرہ لوٹ کے آئے ہیں "
کسی نے شاعروں کا احوال بڑے دردناک انداز میں سردار جی سے کہہ سنایا

اور ساتھ ہی سفارش بھی کر دی کہ بچاروں کو تھوڑا بہت حق المحنت عطا ہو جایا کرے تو اس طرح ریاست اور والئی ریاست کی بڑی نیک نامی ہو گی۔

سردار جی سیدھے سپاٹ آدمی تھے۔ فوراً دیدے گھما کر بولے "فی شاعر کتنی نقدی خرچ ہو گی؟

شاعروں کے ہمدرد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہو گی تو زیادہ۔ مگر آپ فی شاعر پانچ روپے مقرر کر دیجے" سستا زمانہ تھا پانچ روپے بڑی بات تھی۔ سردار جی نے مہتمم خزانہ کو بلایا۔ سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ دیوان جی کو شاعروں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ غالباً اسی لیے دیوان سکھ بیر سنگھ کہلاتے تھے۔ پہلے تو انہوں شاعروں کے سفارش کنندہ کو گھور کے دیکھا۔ پھر آنکھ کے اشارے سے انہیں چپت ہونے کا حکم دیا۔ مکمل تخلیہ ہو گیا تو سردار جی کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولے "مہاراج آپ کے والد انجہانی سردار ٹھیرا سنگھ جی نے تو کبھی شاعروں کو ادھر پھٹکنے نہیں دیا۔ جہاں سن لیا کہ فلاں شخص شاعر ہے محل میں کھٹ اس کا داخلہ بند کر دیا۔ یہ شاعر لوگ تو ویسے ہی شاعری کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں انہیں روپے پیسے کی کیا ضرورت ہے ویسے بھی خزانے پر بڑا بوجھ ہے۔ میری مانیئے تو مشاعرہ بازی ختم کیجئے۔ نیک نامی ہی مطلوب ہے تو دلی سے گانے والیوں کو بلوائیے۔ مجرے کروائیے۔ افسر بھی خوش۔ آپ بھی شانت۔"

سردار جی نے ان کی تجویز مان لی۔ دلی یا لکھنؤ سے گانے والیوں کو بلوانے لگے مگر ان سے غالب یا داغ کی غزلیں سننے کی بجائے اپنا کلام سننے لگے۔ شاعروں کی چھٹی ہو گئی۔ گانے والیاں اپنے لاؤ لشکر سمیت ہفتہ بھر پہلے پہنچتیں۔ سردار جی سے کلام حاصل کرتیں۔ دھن تیار ہوتی۔ اس تیاری میں چھ سات دن لگتے۔ اس دوران گانے والیاں اور ان کے سازندے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے فرمائشوں کی ایسی دھواں دھار

بارش ہوتی کہ دیوان سکھ بیر سنگھ پسینے میں شرابور ہو جاتے لیکن والئی ریاست کے ہر حکم کی تعمیل ضروری تھی۔

اسی ہنگامہ ہاؤ ہو میں سردار جی کو دلی کی ایک گانے والی مجیدن پسند آگئی۔ پہلے تو ایک آدھ بار اسے دلی سے بلایا۔ پھر یہ تکلف چھوڑ دی۔ مستقلاً اسے ریاست میں رہائش کا پابند کر دیا۔ خود بکھیڑا تھے اسے پیار سے بکھیڑن کہتے تھے۔ بکھیڑن بکھیڑا کی پریم کہانی شروع ہو گئے۔ لیکن کہانی میں ایک ولن بھی ہوتا ہے۔ یہاں الیگزنڈر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ مجیدن کو پہلی ہی نظر میں انھوں نے "بہوٹ اچھا چیز ہائے" کہہ کر اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا۔ اگے روز اسے اپنے بنگلے پر مدعو کر لیا اسے لینے کیلئے گاڑی بھیج دی۔ مجیدن نے لیت و لعل سے کام لیا تو خود پہنچ گئے۔ دیسی آدمی چاہے والی ریاست ہی کیوں نہ ہوں، انگریز کے ہنٹر اور تاج برطانیہ سے ڈرتا تھا۔ مجیدن چپ چاپ الیگزنڈر صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سردار جی کو سارا حال معلوم ہوا تو آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ منہ سے جھاگ چھوٹنے لگی۔ اسٹیم انجن کی طرح حلق سے بھاپ نکلنے لگی اور اس نے یہ عبارت لکھوا کر دکان پر لٹکا دی۔

مجیدن کی حلیم جیسے باد نسیم
سب نے کیا تسلیم حلیم، حلیم، حلیم
مجیدن کی حلیم

لیکن افسوس، جس کے لیے سردار جی نے یہ بکھیڑا پھیلایا وہ بکھیڑن اب اس دنیا میں نہیں تھی البتہ اس کی پوتی شنیدن زندہ تھی۔ اور بمبئی کی فلمی دنیا میں ایکسٹرا گرل کے طور پر چھوٹے چھوٹے رول کر کے اپنی زندگی بتا رہی تھی۔ اسے جب سردار جی کی بپتا کی بھنک پڑی تو کہیں سے پتہ ڈھونڈ کے اپنی تصویر کے ساتھ ایک لمبا چوڑا خط سردار جی کے نام لکھ بھیجا کہ فلمی دنیا کی ناقدری اور بے اعتنائی سے تنگ آچکی ہوں۔ مجھے اپنی کنیز بنا لیجئے تصویر بھیج رہی ہوں۔ شنیدن کہ بود مانند دیدہ۔

یہ خط دکان کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ لہٰذا باورچی کے ہتھے چڑھا۔ اس نے فوراً جواب لکھا کہ آپ زحمت نہ کیجئے۔ میں خود پہنچ رہا ہوں۔ بس ذرا دکان فروخت کرلوں خاصی رقم لے کر آؤں گا۔ اطمینان رکھئے۔ سردار جی خود تو کبھی دکان پر جاتے نہیں تھے۔ تمام کاروباری امور باورچی کے ہاتھ میں تھے۔ وہی چھٹے ساتوین دن آکر حساب کتاب دے جاتا ہے۔ اس مرتبہ جب اسے کئی دن بلکہ ایک مہینہ بیت گیا تو سردار جی کو تشویش ہوئی۔ اپنا خاص آدمی دکان پر بھیجا۔ اس نے بڑے اطمینان سے آکر بتایا کہ دکان میر باقر علی داستان گو کے ایک خاص آدمی نے مع سازوسامان خرید لی ہے۔ اور باورچی بمبئی چلا گیا ہے۔ کہہ گیا ہے کہ قسمت نے یاوری کی تو ہیرو بن کر آؤں گا اور آپ کی پائی پائی چکادوں گا۔ ذرا ذرا سی بات پر آنکھیں لال پیلی کرنے، منہ سے جھاگ چھوڑنے اور اسٹیم انجن کی طرح نتھنے پھلا کر شوں شوں کرنے والے سردار بکھیڑا سنگھ کچھ نہیں بولے۔ ریت کی دیوار کی طرح بیٹھتے گئے اور پیغام لانے والے کا منہ دیکھتے گئے۔ بڑی دیر بعد ہونٹ ہلے کہا تو صرف اتنا کہا۔ "ایک گلاس پانی دینا

end